يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرۡبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيۡمٍ (البقرۃ: ۲۷۶)

سود کے جدید مسائل کی تحقیق انیق پر مشتمل کتاب مستطاب بنام

مسائل سود

بقلم

سلطان الاساتذہ، شیخ القرآن حضرت علامہ

عبد اللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ

سابق صدر المدرسین دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی، یوپی

تقدیم، تخریج، تصحیح

مفتی کمال احمد علیمی نظامی

دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی یوپی الھند

بتعاون: الحاج وصی الدین نورانی و برادران

ناشر: مبلغ اسلام ریسرچ سینٹر ممبئی انڈیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ (البقرۃ:۲۷۶)

❁

جدید مسائل سود کی تحقیق انیق پر مشتمل کتاب مستطاب بنام

مسائل سود

❁

بقلم

سلطان الاساتذہ، شیخ القرآن، حضرت علامہ عبد اللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ

سابق شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی بستی یوپی

❁

تقدیم، تخریج، تصحیح

مفتی کمال احمد علیمی نظامی

دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی بستی یوپی

❁

حسب خواہش

الحاج وصی الدین نورانی صاحب و برادران

❁

ناشر

مبلغ اسلام ریسرچ سینٹر، جمداشاہی، ضلع بستی، یوپی (انڈیا)

©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

تفصیلات

❁نام کتاب: مسائل سود

❁مصنف: شیخ القرآن علامہ عبداللہ خاں عزیزی علیہ الرحمۃ

❁حسب خواہش: حاجی وصی الدین نورانی صاحب وبرادران

❁کمپوزنگ: (مولانا) عبدالجبار علیمی نیپالی

❁سنہ طباعت اول: 1413ھ/1993ء

❁سنہ طباعت دوم: ۱۴۴۴ھ/۲۰۲۳ء

❁ناشر: مبلغ اسلام ریسرچ سینٹر جمدا شاہی بستی

Book's Name: **Masail-e-Sood**

Author: Shaikhul Quran, Hazrat Allama ABDULLAH KHAN Azizi (Alaihir rahmah.)

Publisher: Muballigh-e-Islam Research Centre. Jamda Shahi, Basti, UP

Publishing Year: 1st . 1414 AH./1993 CE.
2nd. 1444 AH./ 2023 CE.

ملنے کے پتے

(۱) مبلغِ اسلام ریسرچ سنٹر، جمدا شاہی، ضلع بستی، یوپی

(۲) دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی، یوپی

(۳) دارالعلوم علیمیہ نسواں، جمدا شاہی، بستی، یوپی

(۴) علیمی کتب خانہ، جمدا شاہی، ضلع بستی

فہرست مضامین

۱۔تقریظ جلیل از بحرالعلوم علامہ مفتی عبدالمنان علیہ الرحمہ ______ 7
۲۔حضرت مصنف علام کے مختصر حالات زندگی از مولانا احمد رضا نورانی ______ 9
۳۔تقدیم از کمال احمد علیمی نظامی ______ 17
۴۔تقدیم از مصنف ______ 33
۵۔باب اول ______ 41
۶۔سود کی حرمت کے چار ادوار ______ 41
۷۔دور اول ______ 41
۸۔دور ثانی ______ 42
۹۔دور ثالث ______ 43
۱۰۔دور رابع ______ 43
۱۱۔سود خور کی مخبوط الحواسی کا بیان ______ 45
۱۲۔باب دوم ______ 55
۱۳۔خون کا دریا ______ 55
۱۴۔سانپ کے گھر ______ 56
۱۵۔سود کا گناہ زنا سے کئی گنا زیادہ بدتر ______ 57
۱۶۔سود خوری کا گناہ ماں کے ساتھ زنا کرنے سے بدتر ہے ______ 57
۱۷۔سرکار کی پیشین گوئی ______ 58
۱۸۔سودی کاروبار کی معاونت بھی حرام ہے ______ 59
۱۹۔سود ہلاکت خیز ہے ______ 59
۲۰۔باب سوم ______ 61
۲۱۔سود کا مفہوم ______ 61

۲۲۔ ربٰو کے اقسام ____ 62

۲۳۔ ایک شبہ کا ازالہ ____ 67

۲۴۔ ایک ہی جنس کے تفاوت کا حکم ____ 68

۲۵۔ سوال و جواب ____ 70

۲۶۔ خلاصہ بحث ____ 76

۲۷۔ ربٰوئے نسیہ کی صورتیں ____ 77

۲۸۔ ائمہ کا اختلاف ____ 78

۲۹۔ حنفیہ کا مذہب ____ 78

۳۰۔ شافعیہ کا مسلک ____ 78

۳۱۔ مالکیہ کا مسلک ____ 78

۳۲۔ ایک شبہ کا ازالہ ____ 80

۳۳۔ **باب چہارم** ____ 83

۳۴۔ بینک کاری ____ 83

۳۵۔ عجیب و غریب سوال ____ 86

۳۶۔ ایک علمی لطیفہ ____ 87

۳۷۔ سوال ____ 88

۳۸۔ جواب ____ 88

۳۹۔ سوال ____ 88

۴۰۔ جواب ____ 88

۴۱۔ بینکوں کی زائد رقم کا حکم ____ 89

۴۲۔ نوع اول ____ 90

۴۳۔ نوع دوم ____ 91

۴۴۔ امام احمد رضا کے فتاوے میں کامل توافق ____ 97

۴۵۔ جیون بیمہ کا حکم ________ 101

۴۶۔ **باب پنجم** ________ 109

۴۷۔ لاٹری کی حرمت کا بیان ________ 113

۴۸۔ رشوت ________ 115

۴۹۔ خیانت ________ 120

۵۰۔ مضاربت اور اس کی شرائط باطلہ ________ 122

۵۱۔ شرکت اور اس کے بطلان کے وجوہ ________ 124

۵۲۔ اجارۂ فاسدہ کے چند مسائل ________ 128

۵۳۔ **باب ششم** ________ 131

۵۴۔ صدقہ اور سود میں تضاد ہے ________ 131

۵۵۔ فضائل صدقات ________ 137

۵۶۔ نظام زکوٰۃ کے قیام کا حکم ________ 142

۵۷۔ مسائل زکوٰۃ ________ 147

﴿يمحق الله الربا ويربي الصدقات﴾
في إسناد المحق والإرباء إلى الله مزيد ترهيبٍ من الربا وترغيبٍ في الصدقة.
ربيع القلوب للدكتوريوسف العليوي (ص: ٦)

تقـــریظ جلیـــل

بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد! رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک اور اس کے بعد چند صدیوں تک اہل اسلام کی زندگی کے تمام شعبوں پر قوانین اسلام کی گرفت نہایت مضبوط رہی "پیدائش سے موت تک" ایک مسلمان کی پوری زندگی ہر ہر قدم پر اسلامی سرچشمہ سے ہدایت حاصل کرتی رہی اور پوری حیات اسی کی روشنی میں گزارتی رہی۔

لیکن عہد رسالت سے جیسے جیسے دوری ہوتی گئی عمل کا یہ جوش ٹھنڈا پڑتا گیا، اسلامی تعلیم سے مسلمان دور ہوتے گئے اور موجودہ زمانہ آتے آتے مادی تہذیب و تمدن نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور عام عالم انسانیت کے ساتھ ساتھ مسلمان قوم بھی اس سے بری طرح متاثر ہوئی۔

اسلامی تعزیری قوانین تو اسلامی حکومتوں کے زمانہ میں ہی معطل ہو گئے تھے، آہستہ آہستہ مسلمان "سیاست مدن" سے بھی علاحدہ کر دیئے گئے، اور اس کی تدبیر منزل بھی شرعی گرفت سے باہر ہو گئی۔

اب حال یہ ہے کہ شادی بیاہ کے کچھ مسائل اور کفن دفن کے طریقہ میں تو عام طور سے مسلمان اسلامی احکام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، بقیہ زندگی گزارنے کے طور طریقوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی طرز زندگی کی بالکل ضرورت نہیں رہ گئی۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

ہمارے بچپن تک عام طور سے مسلمان سود سے ڈرتا تھا، جوئے سے خوف کھاتا تھا، دیگر معاملات خرید و فروخت میں بھی مسائل شرع دریافت کر لینے کی ضرورت محسوس کرتا تھا، لیکن اب نئی تہذیب کے جادوگروں نے ایسے ایسے معاملات ایجاد کر رکھے ہیں جن کا ظاہر نہایت تابناک ہے جب کہ اس کے باطن میں سود و قمار کی تمام خباثتیں لپٹی ہوئی ہیں اور ان میں ابتلا اتنا عام ہو گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی آدمی ان سے آلودہ ہو رہا ہے۔

ایسے عالم میں علماے حق کی یہ ذمہ داری تھی کہ پوری طاقت سے ان لوگوں کو آگاہ کریں جو نہیں جانتے، اور ان کی تنبیہ کریں جو جان بوجھ کر آلودہ ہورہے ہیں کہ تبلیغ وہدایت کا اصول یہی ہے۔

نوارا تیز ترمی زن چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چوں محمل راگراں بینی

غفلت اور بدذوقی میں اور بلند آہنگی سے نغمہ زنی کرو، اور جب قافلہ سست رفتار ہو تو اور ہمہمہ سے حدی خوانی کرو۔

ہمارے مکرم ومحترم حضرت مولاناے ذیجاہ محمد عبداللہ خان صاحب عزیزی گونڈوی شیخ الحدیث دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی، ہر طرح اس کے اہل اور مستحق ہیں کہ ان امور میں اہل اسلام کی رہنمائی فرمائیں کہ قرآن عظیم آپ کی ذاتی دلچسپی کا خصوصی مضمون ہے، حدیث وفقہ آپ نے زندگی بھر پڑھائی ہے، قانون اسلام پر مبصرانہ نگاہ ہے، اور موجودہ معاشی مسائل سے بھی آپ غافل نہیں، ہندوستان مین موجودہ علماے اسلام اہل سنت میں آپ کی شخصیت امتیازی شان رکھتی ہے۔

چناں چہ آپ نے نہایت شستہ وشگفتہ لب ولہجہ، سنجیدہ اور متین طرز کلام اور عالمانہ ومحققانہ انداز میں بحث میں چند جدید معاملات پر روشنی ڈالی ہے اور خوب داد تحقیق دی ہے، جس میں نہ تو علماے دنیا کی طرح افراط ہے نہ خواہ مخواہ کی تفریط ہے، بلکہ انتہائی اعتدال کے ساتھ ہر معاملہ کی قرار واقعی قدر وقیمت بیان کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے، مباحث کی تفصیل سے قطع نظر اخذ کردہ نتائج علما وعوام دونوں ہی کی توجہ کے لائق ہیں۔

توقع ہے کہ مولانا نے اب جو یہ سلسلہ شروع کیا ہے تو آئندہ بھی پیش آمدہ مسائل میں اپنی تحقیق کے نتائج سے امت کو آگاہ کرتے رہیں گے، یہ ایک بڑی دینی خدمت ہوگی۔

دعا ہے کہ مولا تعالیٰ حضرت ممدوح کی اس تحریر کو قبول عام بخشے اور ناشر جناب الحاج محمد عمر ڈوسا کی جدوجہد کو قبول فرمائے اور ہم سب اہل اسلام کو اپنے معاملات اسلامی احکام کے دائرے میں سدھارنے کی توفیق کرامت فرمائے آمین۔

عبدالمنان اعظمی
[شیخ الحدیث] جامعہ شمس العلوم گھوسی ضلع مئو

حضرت مصنف علام کے مختصر حالات زندگی

✍ حضرت مولانا محمد احمد رضا نورانی، دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی بستی

نام ونسب اور خاندانی حالات:

اسم گرامی عبداللہ خاں عزیزی بن الحاج محمد ابراہیم خاں مرحوم بن حاجی تعلقدار خاں مرحوم بن جان محمد خاں صاحب مرحوم۔

لقب شیخ القرآن.

آپ کے آباواجداد پشتہا پشت سے زراعت پیشہ رہے، پہلے ریاست بلرامپور میں دو قسم کے کاشت کار پائے جاتے تھے، ایک اسامی دوسرے ٹھیکے دار، پردادا جان محمد پہلے شخص ہیں جو ریاست کی ٹھیکیداری سے بے دخل کیے گئے اور اسامیوں کے زمرے میں داخل ہوئے لیکن جد امجد الحاج تعلقدار خاں ایک بڑے کاشت کار تھے، جن کے پاس کافی اراضی تھی، اور والد ماجد صاحب علیہ الرحمہ کاشت کار ہونے کے علاوہ غلے کے بڑے تاجر تھے، یہ ایک پاک باطن دیانتدار اور نیک انسان تھے، اپنی نیکی اور شرافت طبعی کی بنا پر عوام و خواص میں کافی مقبول رہے، انہوں نے اپنے کسب حلال سے ۱۹۵۰ء میں اپنے والدین کریمین کو حج و زیارت سے مشرف کروایا اور خود بھی ۱۹۵۲ء میں حج و زیارت کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ آپ کے والد ماجد صاحب مرحوم کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا شوق تھا، چناں چہ انہوں نے اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہور فرمایا۔

ولادت باسعادت:

شمالی مشرقی یوپی کے مشہور ضلع گونڈہ جو الگ ہوکر بلرامپور ہوا ہے، اس کے قصبہ پچپڑوا سے جانب شمال تقریبًا ۴ کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل اور پہاڑ کی طرف جانے والے روڈ کے کنارے ایک چھوٹی سی آبادی ''ناؤڈیہہ'' آپ کا مسکن و مولد ہے، یہیں آپ کی ولادت با سعادت ہوئی، اسناد اور سرکاری کاغذات میں تاریخ پیدائش ۱۵؍ نومبر ۱۹۳۵ء درج ہے، میں نے استاذ گرامی حضرت مصنف علام مدظلہ العالی سے دریافت کیا کہ کیا آپ اس مندرجہ تاریخ

پیدائش کی صحت پر یقین رکھتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرے خاندان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، خود میرے والد مکرم حاجی صاحب مرحوم ناخواندہ تھے، اس لیے تاریخ پیدائش کے اندراج کا کوئی رجسٹر نہیں تھا، جس کی بنا پر میں کوئی قطعی بات بتانے سے قاصر ہوں۔

ابتدائی تعلیم:

ناظرۂ قرآن حکیم اور دینیات کی تعلیم کا انتظام گھر ہی پر ہوا، ایک ضعیف العمر مولوی صاحب جن کا نام میاں عبدالرحیم صاحب تھا، انہیں سے اردو کی ابتدائی کتابیں اور قرآن حکیم کے ناظرہ کی تعلیم ہوئی، پھر ایک اچھی صلاحیت کے مولوی صاحب گاؤں کے مکتب میں پڑھانے کے لیے بلائے گئے، ان سے اردو کی بہت سی کتابیں پڑھیں اس کے بعد موضع ناؤ ڈیہہ سے تقریباً ۴ کلو میٹر کے فاصلے پر قصبہ پچپڑوا کے پرائمری اسکول میں داخلہ ہوا، وہاں درجۂ چہارم تک پرائمری تعلیم ہوئی۔

۱۹۴۶ء میں ضلع گونڈہ کے مشہور قصبہ تلشی پور کے مدرسہ انوارالعلوم میں عربی و فارسی کی تعلیم کے لیے داخلہ ہوا، یہیں سے حقیقی بنیادی تعلیم کی ابتدا ہوئی، مدرسہ اس وقت گونڈہ و بستی اضلاع کے مشہور عالم دین، سلطان المناظرین حضرت مولانا عتیق الرحمن خاں صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان کی نظامت و سرپرستی میں چل رہا تھا، یہاں کے اساتذہ مولانا محمد علی صاحب مرحوم جو مفتی اعظم آگرہ مولانا عبدالحفیظ صاحب کے بھائی تھے، قاضی شریعت حضرت علامہ مولانا محمد شفیع صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ بحرالعلوم حضرت علامہ و مولانا مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ علیہ الرحمہ ہیں، آپ کی فطری ذہانت و فطانت کی بنا پر ان اساتذہ کرام نے آپ کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی، جس سے آپ کے ذہن و فکر میں آگے بڑھنے کی صلاحیت بیدار ہوئی۔

اعلیٰ تعلیم:

انوارالعلوم تلشی پور میں درجہ خامسہ تک تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے

۱۹۵۴ء میں دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور میں داخلہ لیا، وہاں آپ نے چار سال تک حافظ ملت حضرت علامہ شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی ، حضرت علامہ و مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ بلیاوی ، شیخ العلما حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی رحمہم اللہ تعالی اور مولانا ظفر ادیبی جیسے باکمال اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔

دارالعلوم اشرفیہ کی چہار سالہ مدت تعلیم نہایت محنت و جاں فشانی میں گزری اور یہیں سے آپ کی فطری صلاحیتیں خوب خوب ابھریں، آپ کی محنت اور مطالعہ سے غیر معمولی دلچسپی ضرب المثل بن گئی تھی، شیخ الحدیث حضرت حافظ ملت قدس سرہ طلبائے دارالعلوم کو تعلیم کی طرف رغبت دلانے کے لیے آپ کو مثالی طالب علم کے طور پر پیش فرماتے تھے، امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونے کے علاوہ ممتحن حضرات سے تقریری امتحان میں بڑی کامیاب اور معرکۃ الآرا بحثیں فرماتے تھے، جس سے نہ صرف آپ کے اساتذۂ کرام بلکہ ممتحن حضرات بھی بہت خوش ہوتے تھے، اور دادو تحسین سے حوصلہ افزائی فرماتے تھے، اس عرصہ متعلیم میں آپ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور عوام و خواص کے دلوں پر آپ کی علمی صلاحیت کا سکہ بیٹھ گیا اور فرزندان اشرفیہ کے نامور علما و فضلا میں شمار کیے جانے کی پیش گوئی اساتذہ کی طرف سے ہونے لگی۔

بیعت و ارادت:

آپ ابھی مدرسہ انوارالعلوم تلشی پور میں زیر تعلیم تھے کہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے بانی حضرت علامہ شاہ عبدالعزیز صاحب مرادآبادی رضی المولی عنہ کی عظیم شخصیت سے بے حد متاثر ہو گئے کیوں کہ حضرت اقدس علیہ الرحمہ بار بار تلشی پور کے سالانہ اجلاس اور امتحان کے سلسلے میں تشریف لے جاتے تھے، ان کی دینداری ان کے اتباع سنت، ان کے علمی مقام، ان کی شفقت و عنایت سے تو متاثر تھے ہی وہاں کے اساتذۂ کرام حضرت علامہ محمد شفیع صاحب اعظمی و حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی کی ایما پر حضرت محدث مرادآبادی نور اللہ مرقدہ کے دست حق پرست سے شرف بیعت حاصل کر کے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں داخل ہو گئے۔

مرید ہونے کے بعد اپنے مرشد بر حق سے اوراد و وظائف کے لیے اجازت چاہی تو انہوں نے فرمایا آپ کے لیے بڑا وظیفہ یہی ہے کہ حصول علم اور مطالعے میں مصروف رہو چناں چہ آج تک پوری پابندی کے ساتھ آپ اس وظیفے پر کاربند ہیں۔

دور تدریس:

۱۹۵۷ء میں تعلیم سے فراغت ہوئی اور اشرفیہ سے سند دستار فضیلت حاصل ہوئی، پھر آپ کی تدریس کا زریں دور شروع ہوتا ہے، سب سے پہلے جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس، پھر شاہجہاں پور کے مشہور مدرسہ فیض عام میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔

دارالعلوم ربانیہ باندہ، دارالعلوم فیض الرسول براوں، جیسے اداروں میں اپنی خداداد علمی صلاحیت کا مظاہرہ کیا، متعدّد دینی درسگاہوں سے منسلک رہے اور جہاں بھی رہے ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی اور ان اداروں کی تعلیمی ترقی میں بڑا اہم رول ادا کیا، ۱۹۷۳ء میں اپنے مرشد بر حق حافظ ملت علیہ الرحمہ کی طلبی پر مرکزی درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ میں تشریف لے گئے، جہاں بارہ سال سے زائد عرصہ تک ہزاروں تشنگان علوم نبویہ کو اپنے چشمہ علم و حکمت سے سیراب کیا اور اس عظیم ادارہ کی نمایاں خدمت انجام دے کر اس کی شہرت و ناموری کو چار چاند لگایا، آپ کی تدریس کا یہ عالم تھا کہ اشرفیہ کے طلبہ اپنی دوسری گھنٹیوں کو چھوڑ کر کبھی کبھی آپ کی درسگاہ کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے، آپ کی کامیاب درسی تقریریں کئی بار ٹیپ بھی کی گئیں، جس سے آپ کی تدریسی کامیابی کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔

۱۹۸۶ء میں کچھ نامساعد حالات کی بنا پر دارالعلوم اشرفیہ سے سبکدوش ہو کر نسبتًا ایک چھوٹی سی درسگاہ دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی کی خدمت پر مامور ہوئے، اس ادارے نے آپ کی قیادت و سرپرستی اور آپ کی بے لوث خدمات کے نتیجے میں تعلیمی میدان میں بڑی برق رفتاری سے پیش قدمی کی اور آج وہ ملک کی نامور درسگاہوں میں شمار کیا جانے لگا اور اس کو بام عروج تک پہونچانے میں اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں اور فکری کوششوں کو بروئے کار لاتے رہے، سچی بات تو یہ ہے کہ اس ادارے کو تعلیمی میدان میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ آپ کی پُر خلوص محنتوں اور مساعی جمیلہ کی مرہون منت ہے۔

سعادت حج وزیارت:

آپ کی گراں قدر اور نمایاں خدمات سے متأثر ہوکر ادارۂ علیمیہ کے خازن جناب الحاج سیٹھ غلام مصطفی رضوی نے اپنے ذاتی صرفے سے زیارت حرمین شریفین کا انتظام کیا، چناں چہ آپ ۱۹۸۹ء میں حج وزیارت کی سعادت سے مشرف ہوئے۔

تصنیف وتالیف:

فضیلۃ الاستاذ کے مقالات ومضامین مطالعہ میں آئے جو زبان وبیان، سلاست و روانی اور معنوی حیثیت سے پر مغز بلکہ ادب عالیہ کا نمونہ ہیں، عہد طالب علمی سے مقالہ نگاری کا شوق رہا اور متعدّد مضامین لکھے، جس میں جسمانی معراج کا شرعی ثبوت، خواطر قلبی کے احکام، اسلام میں عقل انسانی کا احترام، قاری طیب کے تسامحات [کئی قسطوں میں]، مسئلہ کفاءت کی واضح تصویر، عالم خواب کی تفصیل، مرشد برحق کی عظیم شخصیت، حافظ ملت قدس سرہ کا نظریۂ تعلیم، قاضی شریعت اسلام کے بے لوث خادم، بحر العلوم کی بارگاہ میں خراج عقیدت، حدیث ''لا ادری مایفعل بی'' کی شرح [طویل مقالہ] وغیرہ بہت سارے مقالات سیکڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے، قلمی شاہکار منصۂ شہود پر آئے اور اہل علم اور ارباب دانش سے خراج تحسین حاصل کیے۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کے نعتیہ کلام ''حدائق بخشش'' کی شرح لکھنے کا آغاز حضرت مولانا بدر الدین علیہ الرحمہ کی تحریک پر کیا، ابھی چند ہی صفحات لکھ پائے تھے کہ حضرت شیخ العلما نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمایا کہ ''انسان اپنی زندگی میں ایک ہی کام اعلیٰ پیمانے پر انجام دے سکتا ہے، دو کام کرنے کی صلاحیت عام انسانوں میں نہیں پائی جاتی، آپ ایک مانے ہوئے معلم ہیں، تدریسی فریضہ جس ڈھنگ سے آپ انجام دے رہے ہیں، وہ قومی خدمت کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اگر آپ نے تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا تو جس یکسوئی وانہماک کے ساتھ تدریس کا کام کرتے ہیں، اس میں بڑا خلل واقع ہوگا، اس لیے میرے خیال میں فی الحال آپ کے لیے مناسب یہی ہے کہ مصنف بننے کی کوشش نہ کریں یہ دوسری بات ہے کہ وقتاً فوقتاً اہم مسائل پر مقالات ومضامین لکھتے رہیں''

چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ اپنے استاذ کریم کی صائب رائے کی وجہ سے تصنیف و تالیف سے صرف نظر کر کے پینتس ۳۵ سال سے صرف تدریسی خدمت انجام دیتے رہے اور اس پر خوش ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو دین کی خدمت کی توفیق مرحمت فرمائی، ادھر کچھ سالوں سے آپ کے مخلص تلامذہ بے حد مصر تھے کہ تصنیفی کام کی طرف اپنے ذہن و فکر کو مائل کریں اسی وجہ سے حج و زیارت سے مشرف ہونے کے بعد دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل "سفر نامہ" لکھا اور مشکوٰۃ شریف کی منتخب حدیثوں پر تعلیقات بھی لکھے، لیکن ابھی یہ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر نہیں آئیں، البتہ "سفر نامہ حجاز" کی پہلی قسط ماہنامہ اشرفیہ میں شائع ہوئی جس کو اہل علم نے بڑی دلچسپی سے پڑھا اور نہ صرف اس پر مبارکباد پیش کی بلکہ توصیفی الفاظ بھی لکھے۔

خصوصیات

(۱) غیر معمولی علمی انہماک:

حضرت استاذی الکریم ساٹھ سال کی عمر کو پہونچنے والے ہیں، لیکن علمی کد و کاوش میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اپنی زندگی کے لمحات کو اسلامی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دیا ہے اور اس خصوص میں اپنی صحت و توانائی کا بھی کچھ خیال نہیں رکھتے ہیں، بیمار پڑتے ہیں پھر دوا علاج سے جیسے ہی کچھ آرام ملا، اپنے فرائض کی ادائیگی میں لگ جاتے ہیں، اور جوانوں سے زیادہ محنت اور جانفشانی کے عادی نظر آتے ہیں۔

(۲) علوم عقلیہ سے دلچسپی:

فراغت کے بعد عرصہ تک آپ معقولات کی کتابیں پڑھنے پڑھانے سے کافی دلچسپی رکھتے تھے، چناں چہ منطق و فلسفہ کی شاید ہی کوئی متداول کتاب چھوٹی ہو جو آپ کے مطالعے میں نہ آئی ہو، علم کلام سے بھی کافی شغف رہا، اسی وجہ سے عام طور پر یہ بات مسلم تھی کہ ہمارے مخدوم گرامی منطق و فلسفہ اور علم کلام وغیرہ علوم عقلیہ میں مہارت رکھتے تھے،

لیکن خود آپ کا بیان ہے کہ متون کی کتابوں میں سلم العلوم اور تہذیب وغیرہ کو ہمارے اساتذہ نے ازبر کرایا اور زندگی کے بڑے قیمتی ایام ارسطو وافلاطون اور شیخ بوعلی سینا، محقق جلال الدین دوانی، میر زاہد ہروی اور ملا محمود جونپوری وغیرہ کے تحقیقات و تدقیقات میں صرف ہوئے مگر طبیعت میں ان علوم عقلیہ سے کوئی آسودگی پیدا نہ ہوئی اور میری تشنہ لبی ہر وادی و میدان میں مجھ کو سرگشتہ و حیران رکھتی رہی، اب خدا کی توفیق سے میری تمام تر بیزاری طبیعت سب کو فروعی علم خیال کرتی ہے۔

(۳) نزاکتِ احساس:

طبعی طور سے آپ حساس واقع ہوئے تھے، اس لیے معمولی باتوں پر غور و فکر کے عادی نظر آتے، یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی درس گاہوں میں رہ کر جب آپ کے مزاج وہاج کے خلاف کوئی بات سرزد ہوئی تو محاذ آرائی کے بغیر ایسی درسگاہوں کو خیر باد کہنے سے دریغ نہ کیا اب اس کو سماحۃ الشیخ کے عدم تحمل پر محمول کیا جائے یا ان کی خودداری کی بلندی پر، بہر حال جس ادارے میں بھی آپ رہے اس کو اپنے علوم و فنون سے خوب خوب مستفیض فرمایا اور جب وہاں سے چلے آئے تو ان کے خیر خواہ ہی رہے، اور کبھی بھی کسی درسگاہ کے بارے میں کوئی نازیبا لفظ آپ کی زبان مبارک سے سننے میں نہیں آیا، بلکہ اس کی تعریف توصیف میں رطب اللسان ہی رہتے ہیں۔

(۴) درس تفسیر میں امتیاز و مہارت:

آپ کی دلچسپیوں کا مرکز قرآن و حدیث اور ان کے متعلقہ علوم تھے، درس قرآن و ترجمۂ قرآن میں آپ کو جو درک حاصل ہے، میرے اپنے خیال میں اپنی جماعت کے گروہ علما میں کم ہی حضرات کو حاصل ہوگا، ترجمہ قرآن پڑھانے اور درس تفسیر دینے میں خود آپ کے اوپر ایک کیف طاری رہتا اور طلبہ بھی اس کیف سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، غالبًا یہی وجہ ہے کہ لسانِ قوم نے آپ کو شیخ القرآن کے معزز خطاب سے نوازا ہے، حالاں کہ خود آپ کا ارشاد ہے کہ اس بحر ناپیدا کنار اور اتھاہ سمندر کا ایک قطرہ اگر اس حقیر کو مل جاتا تو دنیا میں اس کا شمار اونچے درجے کے انسانوں میں ہوتا، ابھی تو مجھ کو کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور اب کیا

توقع کی جا سکتی ہے کہ کچھ حاصل ہو گا کیوں کہ حیاتِ ناپائدار کے آخری مرحلے میں " منزل آخرت " کی طرف سفرِ حیات جاری ہے، اس لیے خدائے قدوس اگر قرآن و حدیث کی کچھ خدمت لے لے، تو یہی اس کی بخشش کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

(۵) فراہمی کتب کا شوق:

آپ کو کتابوں کے ذخائر جمع کرنے اور ان کو محفوظ رکھنے سے عشق و شیفتگی کی حد تک دلچسپی ہے، یہی وجہ ہے کہ قلیل مدت میں آپ کی کوششوں اور حسن تدبیر سے علیمی لائبریری نے بڑی شہرت حاصل کی، اس میں نادر و نایاب کتابوں کے اکٹھا کرنے میں آپ نے جس حسن تدبر کا ثبوت دیا، وہ سنہری حروف سے لکھنے کے لائق ہے، اپنے مقاصد حیات میں کتابوں کی فراہمی کو اپنی جماعت کے لیے بڑی اہمیت دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ جماعت کی علمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک عظیم لائبریری کی بنیاد ڈالی جائے، جہاں کہیں سفر میں جاتے ہیں کتابوں کی جستجو کی دھن سوار رہتی ہے، ممبئی کا سفر متعدّد بار ہوا اور جب وہاں سے واپس آئے تو دارالعلوم کے لیے کتابوں کا تحفہ لے کر آئے، کبھی کبھی طالب علموں سے مخاطب ہو کر از راہ مزاح فرماتے ہیں کہ "افلاطون" سے زیادہ لذیذ تحفہ میں تم لوگوں کے لیے لاتا ہوں اور اب بھی یہی خواہش و تمنا ہے کہ علیمی لائبریری میں اتنی کتابیں جمع ہو جائیں کہ طبقہ علما میں سے جن حضرات کو کسی عنوان یا موضوع پر تحقیق اور ریسرچ کی ضرورت ہو تو وہ علیمی لائبریری کا رخ کریں، کاش آپ کی یہ تمنا آپ کی حیات میں پوری ہو جاتی۔

❁❁

تقدیم

کمال احمد علیمی، دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی، ضلع بستی

زیر نظر کتاب مسائل سود سے متعلق تحقیقات کا نادر مجموعہ ہے، جس میں صاحب کتاب شیخ القرآن حضرت علامہ عبداللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ نے بڑے نفیس اور علمی وادبی انداز میں سود کے قدیم وجدید مسائل پر تحقیقی انداز میں کلام فرمایا ہے، کتاب کا بنیادی موضوع ''مسائل سود'' ہے، اس لیے علی وجہ البصیرۃ کتاب سے استفادہ کے لیے سب سے پہلے سود کی تعریف وتعارف، سود کی قباحتوں اور سود سے متعلق دیگر مباحث پر مشتمل ایک مختصر سی تحریر حاضر خدمت ہے:

ربا (سود) کی تعریف:

"ربا" کے لغوی معنی زیادت اوراضافہ کے ہیں، قرآن مقدس میں ہے: ''فاذاانزلنا علیھا الماء اھتزت وربت''اس میں ''ربت'' ''ربا'' سے بنا ہے جس کے معنی بڑھنے کے ہیں، اسی طرح عرب میں بولاجاتاہے:''ربا فلان رابیة'' وہ ٹیلے پر چڑھ گیا، یوں ہی اہل عرب کہتے ہیں:"أربی فلان علی فلان فی القول او الفعل اذ ازاد علیه" اسی سے قرآن کریم میں" ربوا" کالفظ آیاہے جس کے معنی زیادتی کے ہیں، حدیث شریف میں ہے:"فلا واللہ ما اخذنا من لقمته الا ربا من تحته" سودی کاروبار کرنے والے کے بارے میں کہاجاتاہے۔" اربی الرجل"۔

اصطلاح شرع میں ہر زیادتی کو"ربا" نہیں کہاجاتاہے، بلکہ مالی لین دین میں ایسامالی اضافہ جس کادوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو ربا کہلاتاہے، فتاوی عالم گیری میں ہے:"فضل مال لا یقابله عوض فی معاوضته مال بمال"۔[فتاوی ہندیہ:۳/۱۱۷ الفصل السادس فی تفسیر الربوا احکامہ]

ہدایہ آخرین میں ہے:"ھو الفضل المستحق لا حد المتعا قدین فی المعاوضة الخالی عن عوض شرط فیه"۔

قاضی بیضاوی نے مذہب شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے ربا کی یہ تعریف کی ہے:"ھو

زیادہ فی الا جل بان یبا ع مطعوم بمطعوم او نقد بنقد الی اجل اوفی العوض بان یباع احد ھما باکثر منه من جنسه"۔[بیضاوی،بقرہ،ص۱۷۲]

امام اہل سنت ربا کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:"وہ زیادت کہ عوض سے خالی ہواور معاہدہ میں اس کا استحاق قرار پایا ہو سود ہے، مثلاً سوروپئے قرض دیے اور یہ ٹھہرالیا کہ پیسہ اوپر سولے گا تو یہ پیسہ عوض شرعی سے خالی ہے، لہذا سود حرام ہے۔[فتاوی رضویہ جدید ۳۲۶/۱۷]

مذکورہ بالا تعریفات سے واضح ہو گیا کہ سود کے دو بنیادی عناصر ہیں،ایک تو عوض سے خالی ہونا، دوسرا شرط لگانا۔

ربا کی قسمیں:

فقہانے ربا کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں:۱۔ربا القرض۔۲۔ربا الفضل،ربا القرض کو ربا النسیئہ اور ربا القرآن بھی کہا جاتا ہے،اول الذکر کی تعریف کرتے ہوئے امام ابو بکر جصاص فرماتے ہیں:

"ھو القر ض المشر و ط فیه الا جل وزیادۃ مال علی المستقرض"۔[احکام القرآن للجصاص،ج۱/۴۶۹]

ربا الفضل کا مطلب یہ ہے کہ ہم جنس اشیا میں تفاضل یا ادھاری کے ساتھ لین دین کیا جائے، جیسے سونے کی بیع سونے سے زیادتی کے ساتھ یا ادھاری کے ساتھ کی جائے،اول الذکر کی حرمت قرآن سے ثابت ہے،اسی لیے اسے ربا لقرآن بھی کہا جاتا ہے، ثانی الذکر کی حرمت حدیث متواتر سے ثابت ہے۔چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عن ابی سعید الخدری قال :قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الذھب بالذھب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل، یدا بید، فمن زاد او استزاد فقد اربی والآخذ والمعطی فیه سواء ۔ [مسلم شریف،باب الربو،ج۲،ص۲۵،قدیمی کتب خانہ کراچی]

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ سرکار ﷺ نے فرمایا: سونے کی خرید وفرخت سونے سے، چاندی کی چاندی سے، گیہوں کی گیہوں سے، جو کی جو سے، کھجور کی کھجور سے، نمک کی نمک سے، برابر برابر دست بدست ہونی چاہیے، جس نے زیادہ دیا یا لیا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔

(۲) عن عبادة بن الصامت رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعیر بالشعیر، والتمر بالتمر، والملح بالملح، مثلا بمثل ،سواء بسواء، یدا بید، فإذا اختلفت هذه الأصناف فبیعوا کیف شئتم إذا کان یدا بید۔[حوالۂ سابق]

عبادہ بن صامت نے سرکار ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا چاندی سے، گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے، نمک کا نمک سے، اس طرح ہونا چاہئے کہ ایک دوسرے کے مثل برابر دست بدست ہوں، ہاں اگر مختلف قسم کی چیزوں کا مبادلہ ہو تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطے کہ لین دین دست بدست ہو۔

(۳) عن ابی سعید الخدری قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: لاتبیعوالذهب بالذهب الا مثلاً بمثل ولا تشفوابعضها علیٰ بعض ولا تبعوا منها غائباً بناجزٍ۔[حوالۂ سابق، ص۲۴]

ابو سعید خدری نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو، مگر برابر برابر، کوئی کسی کو زیادہ نہ دے اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو، مگر یہ کہ ایک دوسرے کے مثل ہو اور کوئی کسی کو زیادہ نہ دے اور ان میں سے غائب کو حاضر کے بدلے نہ بیچو۔

(۴) عن ابی هریرة عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال :التمر بالتمر، الحنطة بالحنطة، والشعیربالشعیر، والملح بالملح مثلاً بمثل یداًبیداٍ، فمن زاداو استزاد فقد اربی الا ما اختلفت الوانه۔ [صحیح مسلم، کتاب المساقات، رقم الحدیث ۱۵۸۸/ سنن نسائی، کتاب البیوع، رقم ۴۵۵۹]

ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کھجور کی فروخت کھجور سے کرو، گیہوں کی گیہوں سے، جو کی جو سے، نمک کی نمک سے، برابر برابر دست بدست ہونی چاہیئے، جس نے زیادہ دیا یا لیا سودی کام کیا، سوائے اس صورت کے کہ اس کے رنگ بدل جائیں۔

ربا کی حرمت منصوص واجماعی ہے:

ربا کی حرمت قطعی ہے، کتاب وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ''یا ایھا الذین امنو الا تاکلو اا لربا اضعا فا مضا عفة وا تقو الله لعلکم تفلحون'' [آل عمران:۱۳۰] مزید ارشاد ہے: ''الذین یا کلون الر بالا یقو مون الا کما یقوم الذي یتخبطه الشیطان من المس'' [بقرہ:۲۷۵]

حدیث شریف میں اکل ربا اور سودی لین دین پر بڑی شدید وعیدیں آئی ہیں، چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: '' اربع حق علی الله ان لا ید خلهم الجنة ولا یذ یقهم نعیمها، مدمن الخمر،وأکل الر با، وأکل مال الیتیم بغیر حق، والعا ق لو الد یه'' [مستدرک للحاکم حدیث نمبر ۲۲۶۰]

مزید ارشاد ہے: ''لعن رسول الله صلی علیه وسلم أ کل الر با و مو کله وشا هد ه و کاتبه'' [مشکوۃ المصابیح، ج۱، ص۲۴۷]

علاوہ ازیں کئی روایتوں میں صراحت ہے کہ سود کے گناہ کے ستر درجات ہیں اور ان میں کم تر درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔ [مجمع الزوائد ۴/۱۱۷]

سود کے دنیوی واخروی نقصانات:

رسول کریم علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق سود خور پر دنیا ہی میں قحط کا عذاب آجاتا ہے، [مسند احمد ج۴ ص۲۰۵]

یوں ہی سود کا انجام قلت مال ہی ہوتا ہے، اگر چہ وقتی طور سے سودی کاروبار سے مال میں کثرت ہوجائے، چناں چہ ارشاد ہے:

مااحد اکثر من الربا الا کان عاقبۃ امرہ الی قلۃ۔[ابن ماجہ:ج۲ص۱۶۵]

یعنی سود کی وجہ سے اگرچہ کسی کا مال بڑھ جائے مگر اس کا انجام قلت مال ہی ہے۔

شیخ القرآن حضرت علامہ عبداللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ ایک حدیث کی روشنی میں سود کی ہلاکت خیزی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجتنبو السبع الموبقات، قیل :یا رسول اللہ! ماھی؟ قال: الشرک باللہ والسحر وقتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق و اکل الربو و اکل مال الیتیم والتولّی یوم الزحف و قذف المحصنات المؤمنات الغافلات۔[صحیح البخاری،کتاب الوصایا،ج۱،ص۳۸۸ قدیمی کتب خانہ کراچی]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات ہلاکت خیز چیزوں سے بچو، کہا گیا: یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کی ذات کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق کسی جان کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، محاذ آرائی کے دن دشمن کے مقابلہ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا، مومن، پاک دامن، بھولی بھالی عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا۔

گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک معمولی دوسرے غیر معمولی بلفظ دیگر ایک صغیرہ، دوسرا کبیرہ، گناہ کبائر کی فہرست میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں دوسری چیزوں کو شمار کرایا وہیں سود خوری کو بھی شمار کیا نیز یہ بتایا کہ یہ سب چیزیں ہلاکت برپا کرنے والی ہیں، خواہ دنیا میں ان سے تباہی و بربادی آئے یا آخرت میں، مسلمانوں کو ان سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے، ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب ہلاکت وادبار کو دعوت دینا ہے۔

ان ارشادات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح ہوا کہ سودی کاروبار یا سود خوری بدترین گناہوں میں سے ہے، ہر ایک مسلمان پر لازم ہے کہ اس نجاست کی آلودگی سے اپنے دامن کو داغ دار نہ کرے، آپ نے مختلف انداز بلکہ حکیمانہ اسلوب بیان سے اس کی حرمت کا صحیح احساس مسلمانوں کو دلایا۔[مسائل سود:ص: ۴۹، مطبع المجمع النورانی جمداشاہی]

حرمت سود کا راز:

سود کی قسم اول کی حرمت کی علت نمایاں کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

فرماتے ہیں:

”وقد ذکر نا ان فیه قلبا لمو ضوع المعا ملات،وان الناس کا نو ا منهمکین فیه في الجا هلیة اشد انهماک وکا ن حدث لا جله محا ربات مستطیر ة و کان قلیله ید عو الی کثیر ہ فوجب ان یسد بابه با لکلیة ولذ لک نزل في القر ان في شانه مانزل“۔[حجۃ اللہ البالغۃ،الجزء الثاني“ ص۱۰۶]

مطلب یہ ہے کہ سود کی حرمت کی وجہ دو باتیں ہیں:ایک تو یہ کہ اس کی وجہ سے باہمی نزاعات پیدا ہوتے ہیں،دوسری یہ کہ سود کا آغاز کم مقدار سے ہوتا ہے، مگر اس کی انتہا کثیر پر ہوتی ہے، سود در سود کا سلسلہ چلتا رہتا ہے،اسی لیے شریعت اسلامیہ نے بالکلیہ اس کا دروازہ بند کر دیا۔

ربو الفضل یعنی سود کی قسم ثانی کی حرمت میں راز کیا ہے ؟اس کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے شیخ القرآن، حضرت علامہ عبداللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

”ان تمام تفصیلات سے واضح ہوا کہ ربائے حقیقی کا دروازہ مکمل طور سے بند نہیں ہو سکتا جب تک کہ ربا الفضل یعنی خرید و فروخت کے معاملات میں جو ربا ہوتا ہے اس پر پابندی عائد نہ کی جائے کیوں کہ اس قسم کے سود سے ربائے حقیقی کی ذہنیت کو بڑھاوا مل سکتا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کی ربائے حقیقی کی طرف جانے کے یہ سب راستے تھے،اس لیے شارع حکیم نے ان سب کو سختی کے ساتھ ممنوع قرار دیا،کیوں کہ شریعت اسلامی کا عام دستور یہ ہے کہ جب کسی چیز کو حرام کیا جاتا ہے تو اس کی طرف لے جانے والے تمام راستوں کو بھی ایک ایک کر کے بند کر دیا جاتا ہے، لیکن انسانی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کی سبیلیں بھی نکالی جاتی ہیں،اور وہ سبیل اس مسئلہ میں یہی تھی کہ اگر کوئی عمدہ شئی ہو اور اسی کی جنس سے جو کم درجہ کی ہو مبادلہ کیا جائے تو اس گھٹیا چیز کو قیمتوں سے بدل لیا جائے، تھوڑی سی زحمت ضرور اٹھانی پڑے گی لیکن شیطان کے داخل ہونے کا دروازہ بالکل بند ہو جائے گا“۔[مسائل سود، ص۲۷،المجمع النورانی دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی]

امام اہل سنت حرمت سود کی علت کے بارے میں سوال کرنے پر ارشاد فرماتے ہیں:

''سود حرام قطعی ہے اور اس پر سخت شدید وعیدیں قرآن واحادیث صحیحہ متواترہ میں وارد اور یہ کہ وہ کیوں حرام ہوا اور اس قدر اس پر سختی کیوں ہے؟ اس کا قرآن عظیم نے دو جواب عطا فرمائے، ایک عام اور ایک خاص، عام تو یہ ہے کہ:'' لا یسئل عما یفعل و هم یسئلون، ان الحکم الا لله ،له الحکم والیه تر جعون، وما کان لمو من ولا مؤ منة اذاقضی الله ورسو له امراان یکون لهم الخیرة من امر هم و من یعص الله ورسوله فقد ضل ضلا لا مبینا'' ترجمہ: اللہ جو کچھ کرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں اور سب سے سوال ہوگا، حکم نہیں مگر اللہ کو، اسی کی حکومت ہے، اور تمھیں اسی کی طرف پھرنا، کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور رسول کسی بات میں کچھ حکم کریں تو انہیں کچھ اپنا اختیار باقی رہے اور جو اللہ ورسول کے حکم پر نہ چلے بے شک وہ صریح گمراہی میں بھٹکا۔'' [فتاوی رضویہ، ۱۷/ ۳۵۸، ۳۵۹ مرکز اہل سنت برکات رضا رضا پور بندر گجرات] اور خاص یہ کہ کافروں نے اعتراض کیا تھا'' انما البیع مثل الر با' بے شک بیع سود کی مثل ہے، تم جو خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام کرتے ہو ان میں کیا فرق ہے، بیع میں بھی تو نفع لینا ہوتا ہے، اس کا جواب ارشاد فرمایا:'' **واحل الله البیع وحرم الر با**'' ترجمہ: اللہ نے حلال کی بیع اور حرام کیا سود۔ تم ہوتے ہو کون، بندے ہو، سر بندگی خم کرو۔ حکم سب کو دیے جاتے ہیں، حکمتیں بتانے کے لیے سب نہیں ہوتے، آج دنیا بھر کے ممالک میں کسی کی مجال ہے کہ قانون ملکی کے کسی دفعہ پر حرف گیری کرے کہ یہ بے جا ہے، یہ کیوں ہے، یوں نہ چاہیے، یوں ہونا چاہیے تھا، جب جھوٹی فانی مجازی سلطنتوں کے سامنے چوں چرا کی مجال نہیں ہوتی، تو اس ملک الملوک بادشاہ حقیقی ازلی ابدی کے حضور کیوں، اور کس لیے کا دم بھرنا؟ کیسی سخت نادانی ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ''۔ [فتاوی رضویہ ج ۱۷ ص ۳۵۸- ۳۵۹ برکات رضا پور بندر گجرات]

صحابہ کرام کا حزم واحتیاط:

چوں کہ سود سے متعلق قرآنی احکامات کا نزول سب سے اخیر میں ہوا تھا، اور نبی کریم علیہ السلام کی طرف سے اس کی بہت زیادہ توضیح وتشریح نہ ہو سکی اسی لیے صحابہ کرام سود سے خود بھی بچتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے، چناں چہ حضرت عمر کا ارشاد

ہے:

ان آخر ماانزلت آية الربا وان رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الربوا والريبة۔ آخر آخر میں نازل ہونے والی آیت سود والی آیت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تفسیر نہیں فرما سکے، لہذا سود اور شبہہ سود سے بچو۔ [سنن ابن ماجہ: ج۲ص۱۶۵]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ حزم واحتیاط ملاحظہ فرمائیں، فرماتے ہیں:

اذا اقرض احدكم اخاه قرضا فاهدى اليه طبقا فلا يقبله او حمله على دابته فلا يركبها الا ان يكون جرى بينه وبينه مثل ذالك۔ [سنن ابن ماجہ، باب القرض، ج۲ص۶۱]

جب تم سے کوئی اپنے بھائی کو قرض دے اور وہ بھائی اس کو کوئی طشت (کھانے کا سامان) بھیجے یا اپنی سواری پر سوار کرے تو اسے قبول نہ کرے اور سوار نہ ہو، الا یہ کہ پہلے بھی ان دونوں میں اس طرح کا لین دین رہا ہو۔

سود کی علت:

سود کی علت کو لے کر ائمہ کرام میں اختلاف ہے، چناں چہ امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک دو چیزوں میں کمی بیشی اس وقت سود ہوگی جب دونوں کی قدر و جنس ایک ہو، قدر سے مراد کیل و وزن ہے، جب کہ جنس سے مراد یہ ہے کہ دو چیزیں ایک ہی جنس کی ہوں، مثلاً گیہوں کی بیع گیہوں سے، جو کی بیع جو سے، آپ عددی چیزوں میں کمی زیادتی کو سود نہیں قرار دیتے، مثلاً سیب وزن سے بکتا ہے تو سیب کی بیع سیب سے ہو اور اس میں کمی زیادتی ہو تو یہ سود ہے جب کہ انڈا گن کر بیچا جاتا ہے، اس لیے ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے جائز اور سود سے خالی ہے۔

امام شافعی کے نزدیک علت سود سونے اور چاندی میں زر یعنی ثمنیت ہے اور باقی چار چیزوں میں ''مطعوم'' ہونا ہے۔ لہذا جو چیزیں ان دونوں علتوں سے خالی ہوں، مثلاً تانبا پیتل وغیرہ ان کی بیع میں کمی زیادتی سود نہیں۔

مالکیہ کا مسلک: مالکیہ کے نزدیک روزی یا روزی بننے کی صلاحیت ہی حرمت ربٰو کی علت ہے۔

عبدالملک بن ماسجون کا مسلک: یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے فائدہ حاصل کیا جائے اس میں زیادتی ربٰو ہے۔[تفسیر کبیر ج ۷ ص ۸۷]

ان مسالک پر تجزیاتی تبصرہ کرتے ہوئے شیخ القرآن فرماتے ہیں:

"یہ مسالک و مذاہب اختلاف علت کی وجہ سے وجود میں آئے، جن کے سبب بہت سے جزوی مسائل میں ائمہ کرام کے درمیان اختلاف رونما ہوا، جس کے نزدیک انتفاع والی چیز میں سود ہوتا ہے اس کے یہاں ربٰو کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا، مثلاً ایک آم دے کر دو آم لینا جائز نہ ہو گا کیوں کہ اس سے بھی فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک اس میں ربٰو نہ ہو گا، اس لیے کہ یہ کیلی یا وزنی چیز نہیں ہے، یوں ہی شافعیہ کے نزدیک لوہا، تانبہ، پیتل، جستہ جملہ معدنیات نیز تمام ایسی چیزیں جن میں غذائیت نہیں ہوتی اور ساتھ ہی وہ ثمن نہیں بنتے ان میں سود کا تحقق نہ ہو گا، اور حنفیہ کے نزدیک ان میں سود کا تحقق ہو گا، خلاصہ یہ ہے کہ اختلاف علت کی وجہ سے جزئیات میں اختلاف ہوا اور اسی اختلاف کو دیکھ کر دور حاضر کے کچھ لوگوں نے یہ استدلال کیا کہ سود کی حرمت ایسی قطعی اور لازمی نہیں ہے کہ تجارتی اشیا میں بھی سود ہو اور اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہا گیا کہ جب اب تک یہی فیصلہ نہیں ہو پایا کہ کن کن چیزوں میں سود متحقق ہوتا ہے اور کن میں نہیں ہوتا، سود کے معنی و مفہوم میں جب اس قدر ابہام و اجمال پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے زراعتی، صنعتی، تجارتی کاموں کے لیے جو سود لیا جاتا ہے وہ کیوں کر ناجائز ہو گا اور جدید بینک کاری جس کی بنیاد ہی زائد مال کے لینے پر ہے وہ کیسے حرام ہو گی، کیوں کہ موجودہ بینک کا نظام اگر بالکلیہ ختم ہو جائے تو تمام صنعتی ادارے، تجارتی منڈیاں تباہ و برباد ہو جائیں گی اور زراعت و صنعت کا کام بالکل ٹھپ پڑ جائے گا، اس لیے جب سود مشتبہ چیز ہوئی جس کی حقیقت کے تعین سے علمائے اسلام عاجز رہ گئے تو اس کے سبب تمام کاروباری نظام کو کیوں کر تہس نہس کیا جا سکتا ہے"۔[مسائل سود، باب سوم، ص:۶۰]

سود میں نفع ہے یا نقصان؟:

عصر حاضر میں زراعتی، تجارتی اور صنعتی میدان میں ہر جگہ سود کی کار فرمائی نظر آتی ہے،

بہت سارے لوگ سودی کاروبار کر کے بے پناہ دولت کمار ہے ہیں، بڑی بڑی کمپنیاں اربوں کھربوں اینٹھ رہی ہیں، پوری دنیا کا تجارتی نظام کہیں نہ کہیں سود کی نحوست میں ملوث نظر آتا ہے، ایسے میں اگر سود کو حرام اور مضر قرار دیا جائے تو دو خرابیاں لازم آئیں گی: ایک تو یہ کہ دنیا کے اکثر صنعت کار اور تجارت پیشہ لوگ ارتکاب حرام میں ملوث ہوں گے، دوسری یہ کہ اسلام کا یہ کہنا کہ سود میں نقصان ہی نقصان ہے غلط ہوگا۔

اس وہم کا ازالہ کرتے ہوئے شیخ القرآن علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں جس میں نفع و نقصان دونوں نہ پائے جاتے ہوں، اگر سنکھیا زہر قاتل ہے تو اس کے بھی کچھ فوائد ایسے ہیں جن کے اچھے اثرات دواؤں میں ظاہر ہوتے ہیں، اگر شراب کی تباہ کاریوں سے بہت سے کنبے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے، جبھی الکحل کی شکل میں دواؤں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، کتنی گندی اور فاسد چیزیں ہیں جن کے خیال ہی سے طبیعت میں انقباض پیدا ہوتا ہے، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جن سے یک گونہ فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، مگر ان فوائد و منافع سے یہ تمام گندی اور مہلک چیزیں ہر حالت میں مباح نہیں کی جاسکتیں، کیوں کہ اشیا کی حلت و حرمت کا معیار یا دار و مدار ان کے غالب فوائد یا نقصانات پر ہے، اگر کسی چیز کے اندر بے انتہا مضرتیں پائی جارہی ہوں تو یہ نہیں کہا جا سکتا اس میں کچھ نفع ہے، اس لیے انسانوں کے لیے اسے جائز ہونا چاہیے، ٹھیک اسی طرح سود کے کچھ معمولی فوائد ہو سکتے ہیں اور ان فائدوں کی جھلکیاں بھی دکھائی پڑ سکتی ہیں، لیکن اس کی مضرتیں، اس کی تباہ کاریاں، اس کی نجاستیں، اس کی غلاظتیں اور اس کی قباحتیں اتنی زیادہ ہیں کہ عقل و خرد کا فیصلہ یہی ہونا چاہیے کہ کسی مجبوری کے بغیر کوئی ذی ہوش انسان اس کے قریب نہ پھٹکے، اگر ایک طرف تم کو یہ نظر آتا ہے کہ کچھ بے روزگاروں کو روزگار مل رہا ہے تو دوسری طرف تم کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے کہ اس سے کتنے کنبوں کی تباہی و بربادی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں، اگر تم ایک طرف یہ دیکھتے ہو کہ اسی سود کی بدولت منڈیوں کی رونق برقرار ہے تو دوسری جانب تمہیں اس سے بھی آنکھیں بند نہیں رکھنا چاہیے کہ غریبوں، محتاجوں، کی ساری پونجی یا ان کی گاڑھی کمائی بلکہ ان کے خون کا آخری قطرہ سرمایہ

پرستوں کی کوٹھیوں کی لالہ زاری میں اضافہ کر رہا ہے، حق یہ ہے کہ اس کے مفاسد کے مقابلے میں اس کے فوائد بہت کم ہیں لہٰذا اس کی ظاہری دیدہ زیبیوں اور دلفریبیوں سے اہل بصیرت کو دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔

اس کے علاوہ جو کچھ معاشی ترقیاں اور ان کے جلوے نظر آرہے ہیں وہ محض سودی کاروبار کی برکت نہیں ہے، زمانے کی رفتار انسان کی ذہنی نشوونما کا باعث ہوئی، اس لئے اپنے علمی اکتشافات سے عہد حاضر کے انسان نے سائنس اور فلسفے میں پیش رفت کرکے ایسے آلات ایجاد کیے جن سے اس کی معاشی ترقی کی رفتار تیز تر ہوگئی، پس تمام خوش حالیوں اور ترقیوں کا سہرا سود کے سر ڈالنا بالکل غلط ہے۔[مسائل سود، باب سوم، ص ۶۲]

عصر حاضر کے تناظر میں پیدا شدہ ایک اضطراب کا حل:-

امام اہل سنت اعلی حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ سے سوال ہوا:

اللہ جل شانہ نے اپنے کلام پاک قرآن مجید میں سود خوری کی سختی سے وعید فرمائی ہے اور بیشک قرآن حکیم کے اوامر و نواہی انسان کے لیے دارین میں سود مند ہیں، اس کے ہر فرمان پر ہمارا سر تسلیم خم ہے، مگر مزید اطمینان کے لیے استفتا کرنے کی ضرورت پڑی کہ سود دینا اور سود لینا دونوں قطعی حرام ہیں، میرے ناقص خیال میں ہزار میں سے ایک شخص بھی ایسا مشکل سے نکلے گا جو مقدم الذکر دو بلاؤں میں سے کسی ایک میں مبتلا نہ ہوا، تجارت کے کاروبار شاید ہی بغیر سود کے انجام پائیں، یہ ایک قابل غور بات ہے کہ فی زمانہ شرح سود اس قدر کم ہے کہ دینے والا خوشی سے ادا کرتا ہے، اس پر کسی طرح کا بار نہیں پڑتا ہے، کیوں کہ اس کو فی صدی آٹھ آنے دینا پڑتا ہے تو ان روپوں سے تجارت کرکے سیکڑے دس پیدا کرتا ہے، اس لیے لینے والا اور دینے والا دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں، تو معروض یہ ہے کہ اس آیت کا شان نزول کیا ہے، ربا کے جواز وعدم جواز میں کیا راز مضمر ہے، اور اتنی سختی کے ساتھ ممانعت کی کیا باعث ہے، مفصل تحریر فرماکر کم ترین کو مطمئن فرمائیں، بغیر سود کے آج کل بیوپار کرنا مشکل نہیں تو محال ضرور ہے، خاص کر کے ولایت کی تجارت کا دار و مدار ہی سود پر ہے، مثلاً بمبئی میں ولایت کی ہنڈوی کا بھاؤ آج پندرہ روپے ہے تو کل پونے پندرہ تو پرسوں ساڑھے پندرہ، تو پھر ایسی حالت میں سود سے بچنا کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ لاکھوں کا لین دین

ہوتا ہے، چوں کہ آج کل تجارت زیادہ تر غیر قوموں کے ہاتھ میں ہے توان کے ساتھ باہم خرید وفروخت میں بغیر لیے دئے کے چل نہیں سکتا، تواس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ مسلمان اعلی پیمانہ پر تجارت نہ کریں، صرف قوت بسری کے لئے کچھ تھوڑا بہت کرلیا کریں، جس طرح بنی اسرائیل پر اونٹ کا گوشت اور چربی وغیرہ حرام کردی گئی تھی، آج کل تجارت میں بڑا نقص یہ بھی ہے کہ مال زیادہ تر ادھار بکتا ہے، توایسی حالت میں اگر خریدار کے ذمہ سود نہ لگایا جائے توشائد وہ مہینے میں دینے والا برس بھر میں مشکل سے ادا کرے، کافروں کے ذمہ جو سود عائد ہوتا وہ ان سے وصول کرکے غریب مسلمان کو جو تعلیمی اخراجات کے بار کے متحمل نہیں ہوسکتے اور بے علمی کی وجہ سے اکثر مسلمانوں کے لڑکے آوارہ ہوجاتے ہیں اور رذیل پیشہ اختیار کرکے بے عزتی کی زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ نان شبینہ کے محتاج ہوجاتے ہیں، ایسے محتاج مسلمانوں کے تعلیمی امدادی فنڈ میں دیا جائے تو کیا قباحت ہے، کیوں کہ تین دن کے فاقہ پر حرام بھی کھانا حلال ہوجاتا ہے۔ سود خور اور سود دینے والے کے لئے اس قدر عتاب انگیز کلمات لکھے گئے ہیں کہ اس کے یہاں کھانا تو درکنار اس کے سایہ میں بیٹھنا بھی ایک سخت گناہ ہے، پھر ایسی حالت میں جب کہ دنیا بھر میں ہزار میں سے ایک بھی اس دقت سے بری نہیں ،کیا حال ہوگا کہ ممالک اسلامیہ میں بھی بنک کھولے گئے ہیں اور برابر لین دین ہوتا ہے، البتہ طبقہ علما ومشائخ اس سے محترز ہے، مگر جب وعظ ونصیحت کے لیے نکلتے ہیں توان بیچاروں کو بھی سفر میں جن کے یہاں کھانے پینے کا اتفاق ہوتا ہے اکثر سود لینے یا دینے والے ہوتے ہیں، پھر مجبوری سے کہو یا خوشی سے مگر میں نے کسی عالم یا مشائخ کو اس بارے میں کسی طرح کا اعتراض نکالتے نہیں دیکھا ہے، ماسوا اس کے کہ مدرسوں اور دینی امورات کے لئے جو چندے وصول کیے جاتے ہیں ان میں سے شاید ہی کسی ایسے کا چندہ ہو جو اس بلا سے بچا ہوا ہو، مورخ خلکان نے امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالی علیہ کے حالات کے ضمن میں ایک حکایت لکھی ہے کہ امام صاحب سے شہاب الدین غوری نے ایک کثیر رقم قرض لی تھی، جب اس کو ادا کیا تو صلہ کے طور پر بہت بڑی رقم اضافہ کرکے دی تھی تو اس زیادہ کی رقم کو کیا کہنا چاہئے اور اس طرح لینا بھی جائز ہے کیا؟ فقط۔

اس اضطراب کا جواب دیتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

الجواب الملفوظ: سود حرام قطعی ہے اور اس پر سخت شدید وعیدیں قرآن واحادیث صحیحہ متواترہ میں وارد اور یہ کہ وہ کیوں حرام ہوا اور اس قدر اس پر سختی کیوں ہے اس کے جواب میں قرآن عظیم نے دو جواب عطا فرمائے: ایک عام اور ایک خاص، عام تو یہ کہ: **لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون۔ ان الحکم الا للہ ،للہ الحکم والیہ ترجعون۔ وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔** اللہ جو کچھ کرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں اور سب سے سوال ہوگا، حکم نہیں مگر اللہ کو، اسی کی حکومت ہے، اور تمھیں اسی کی طرف پھرنا، کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ گنجائش نہیں کچھ کہ جب اللہ اور رسول کسی بات میں کچھ حکم کریں تو انھیں کچھ اپنا اختیار باقی رہے اور جو اللہ ورسول کے حکم پر نہ چلے بیشک وہ صریح گمراہی میں بھٹکا۔ اور خاص یہ کہ کافروں نے اعتراض کیا تھا: **انما البیع مثل الربٰو** (بے شک بیع سود کی مثل ہے) [القرآن الکریم ۲/ ۲۷۵] تم جو خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام کرتے ہو ان میں کیا فرق ہے بیع میں بھی تو نفع لینا ہوتا ہے، اس کا جواب ارشاد فرمایا: **واحل اللہ البیع وحرم الربٰو**۔ اللہ نے حلال کی بیع اور حرام کیا سود۔ [القرآن الکریم ۲/ ۲۷۵] تم ہوتے ہو کون، بندے ہو، سر بندگی خم کرو، حکم سب کو دئے جاتے ہیں، حکمتیں بتانے کے لیے سب نہیں ہوتے، آج دنیا بھر کے ممالک میں کسی کی مجال ہے کہ قانون ملکی کسی دفعہ پر حرف گیری کرے کہ یہ بیجا ہے، یہ کیوں ہے، یوں نہ چاہئے، یوں ہونا چاہیے تھا، جب جھوٹی فانی مجازی سلطنتوں کے سامنے چون وچرا کی مجال نہیں ہوتی تو اس ملک الملوک، بادشاہ حقیقی ازلی ابدی کے حضور کیوں ،اور کس لیے کا دم بھرنا، کیسی سخت نادانی ہے، والعیاذ باللہ تعالی۔

سود لینا مطلقاً عموماً قطعاً سخت کبیرہ ہے اور سود دینا اگر بضرورت شرعی ومجبوری ہو تو جائز ہے ،در مختار میں ہے: **یجوز للمحتاج الاستقراض بالربٰو**۔ محتاج سود پر قرض لے سکتا ہے، ہاں بلا ضرورت جیسے بیٹی بیٹے کی شادی یا تجارت بڑھانا یا پکا مکان بنانے کے لیے سودی روپیہ لینا حرام ہے، سود خور کے یہاں کھانا نہ چاہئے مگر حرام وناجائز نہیں، جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ چیز جو ہمارے سامنے کھانے کو آئی بعینہٖ سود ہے، مثلاً گیہوں کی روٹی جو اس

نے سود میں لیے تھے یا سود کے روپے سے اس طرح خریدی گئی ہے کہ اس پر عقد و نقد جمع ہو گئے، یعنی سود کا روپیہ دکھا کر اس کے عوض خریدی اور وہی روپیہ اسے دے دیا، جب تک یہ صورتیں تحقیق نہ ہوں وہ کھانا حرام ہے نہ ممنوع۔ في الهندية عن الذخيرة عن محمد به ناخذ مالم نعرف شيئا حراما بعينه، ہندیہ میں بحوالہ ذخیرہ امام محمد سے منقول ہے کہ ہم اسی (قول جواز) کو لیتے ہیں، جب تک بعینہ کسی شے کا حرام ہونا معلوم نہ ہو جائے، تو نہ خلق پر تنگی ہے، نہ علما پر اعتراض، ہاں تجارت حرام کے دروازے آج کل بکثرت کھلے ہیں، ان کی بندش کو اگر تنگی سمجھا جائے تو مجبوری ہے، وہ تو بیشک شرع مطہر نے ہمیشہ کے لیے بند کیے ہیں، جو آج بے قیدی چاہے کل نہایت سخت شدید قید میں گرفتار ہو گا اور جو آج احکام کا مقید رہے کل بڑے چین کی آزادی پائے گا۔ دنیا مسلمان کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت، مسلمانوں سے کس نے کہا کہ کافروں کے اموال کی وسعت اور طریق تحصیل آزادی اور کثرت کی طرف نگاہ پھاڑ کر دیکھے، اے مسکین! تجھے تو کل کا دن سنوارنا ہے، يوم لاينفع مال ولا بنون الا من اتى الله بقلب سليم ۔ جس دن نہ مال نفع دے گا نہ اولاد، مگر جو اللہ کے حضور سلامت والے دل کے ساتھ حاضر ہوا۔ اے مسکین! تیرے رب نے پہلے ہی تجھے فرما دیا ہے: ولا تمدن عينيك الى ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحيوة الدنيا لنفتنهم فيه ورزق ربك خير وابقى۔ اپنی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ اس دنیوی زندگی کی آرائش کی طرف جو ہم نے کافروں کے کچھ مردوں و عورتوں کے برتنے کو دی تا کہ وہ اس کے فتنہ میں پڑے رہیں اور ہماری یاد سے غافل ہوں اور تیرے رب کا رزق بہتر ہے اور باقی رہنے والا۔ [فتاوی رضویہ: ج ۷ اص ۳۵۷ تا ص ۳۶۱]

زیر نظر تالیف:

شیخ القرآن علیہ الرحمہ کے فقہی تبحر کی عظیم نشانی ہے، اس کتاب کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ شیخ القرآن ایک عظیم مفسر اور بلند پایہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ لائق و فائق مفتی اور متبحر فقیہ بھی تھے، اپنے دور میں پیدا شدہ نو پید مسائل کا حل جس طرح سے آپ نے پیش فرمایا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک محتاط اور بالغ نظر مفتی اور مسائل جدیدہ کے محقق تھے۔

"ربا" جس کی حرمت وقباحت شریعت اسلامیہ میں مسلم ہے، اسی سے متعلق قدیم وجدید مسائل پر شیخ القرآن نے اس کتاب میں نایاب تحقیقات پیش فرمائی ہیں، کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: میں حرمت سود کے ادوار پیش کیے گئے ہیں، اور سود کی شناعت وقباحت پر عقل ونقل سے استدلال کرتے ہوئے معلومات کا ایک خزانہ پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم: میں مصنف نے سود کی حرمت وقباحت پر متعدّد احادیث واقعات سے استدلال پیش کرتے ہوئے ثابت فرمایا ہے کہ سود ہلاکت خیز ہے، اور سودی کاروبار نہ تو کرنا جائز ہے، اور نہ ہی اس کاروبار میں کسی طرح کی معاونت جائز ہے۔

باب سوم: میں ربا کی لغوی وشرعی تحقیق پیش کی گئی ہے، ربا کی مختلف صورتوں کا حکم، اور اس بارے میں ائمہ کرام کے اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب چہارم: میں بہت سارے نو پید مسائل زیر بحث آئے ہیں، مثلاً بینک اور اس کے انٹرسٹ کا مسئلہ، جیون بیمہ اور اس طرح کی اسکیموں سے نفع اندوزی کا مسئلہ، یہ سارے مسائل شیخ القرآن علیہ الرحمہ نے بڑے حسن وخوبی کے ساتھ حل فرمائے ہیں۔ اس بارے میں شیخ القرآن نے فتوی کے ساتھ تقوی کا دامن بھی نہیں چھوڑا ہے، امام احمد رضا قدس سرہ کے فتاوی سے استناد بھی کیا ہے، اور اعلی حضرت کے فتاوی کے نکات بھی بیان فرمائے ہیں۔

باب پنجم: میں بیوع فاسدہ کا بیان ہے، اس باب کے تحت خون کی خرید وفروخت، لاٹری کی حرمت اور مضاربت وشرکت سے متعلق بہت سارے تحقیق طلب مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

باب ششم: میں سود اور صدقہ میں فرق، مال جمع کرنے کی سزا، مصارف زکاۃ، زکاۃ کی حکمت بالغہ، صدقہ کا مفہوم اور بہت سارے مسائل زکاۃ کا بیان ہے، بلاشبہ یہ باب اس کتاب کا خلاصہ ہے۔

کتاب کا انتساب حضور حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمہ کی طرف ہے، اور اس پر تقریظ جلیل بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی علیہ الرحمہ کی

ہے، صاحب کتاب کے حالات زندگی پر ایک وقیع تحریر حضرت علامہ احمد رضا بغدادی استاذ دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی بستی کی طرف سے پیش کی گئی ہے، اور تقدیم خود شیخ القرآن نے لکھی ہے۔ کتاب لکھنے کی تحریک الحاج احمد عمر ڈوسا صاحب ممبئی نے دی، اور اس کتاب کی طباعت واشاعت اول کے اخراجات بھی آپ ہی نے برداشت کیے۔

بہر حال یہ کتاب شیخ القرآن کی بہت ہی عظیم تحقیقی علمی یادگار ہے، ہر طالب علم اور متلاشی حق کو اس کا مطالعہ سود مند رہے گا۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر راقم الحروف نے ارادہ کیا کہ اس عظیم کتاب کی دوبارہ اشاعت ہو، جدید کمپوزنگ، محتاط ایڈیٹنگ، عمیق تخریج اور حسن ترتیب کے ساتھ یہ کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، امید کہ اہل علم اس سے بھرپور استفادہ فرما کر ہمیں اپنی دعاؤں سے سرفراز فرمائیں گے۔

کتاب کی دوسری اشاعت مخیر قوم، علم دوست، علما نواز، محب شیخ القرآن، عالی وقار، الحاج وصی الدین برکاتی اور ان کے جملہ برادران کی طرف سے اپنے والدین اور صاحب کتاب کے ایصال ثواب کے لیے کی جارہی ہے، اللہ تعالی اس کار خیر کے صدقے میں حاجی صاحب کے والدین کے درجات بلند فرمائے اور حضور شیخ القرآن کے فیوض وبرکات سے مالا مال فرمائے۔ آمین یارب العالمین بجاہ سید المرسلین۔

تقدیم

مصنف علاّم علیہ الرحمۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم   حامداً و مصلیاً

میں سخت بیمار و علیل تھا دل و دماغ بہت متاثر تھے، محب مکرم مولانا معین الحق علیمی صاحب کی طلب پر علاج کے لیے ۱۹/ جولائی ۱۹۹۱ء کو ممبئی پہونچا اور یہی "سفر علاج" خدائے قدوس کی کرم فرمائی کا سبب بن گیا کہ ہمارے قدیم ملاقاتی اور مخلص محترم جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب ڈوسا سے ملاقات ہوئی تو وہ بڑی نیاز مندی اور نہایت خلوص و محبت سے پیش آئے، ان کے توسط سے ممبئی کے ایک مشہور و معروف معالج کا علاج ہوا، جب طبیعت کچھ رو بصحت ہوگئی اور جسم میں اتنی توانائی آگئی کہ آنے جانے میں کسی قسم کی دشواری کا احساس نہ رہا تو حاجی صاحب موصوف ایک روز اپنے فرزند جناب عبدالمجید صاحب کے ہمراہ اپنے برادر کلاں عالی مرتبت الحاج محمد عمر صاحب ڈوسا کے دولت کدے پر مجھ کو لے گئے، یہ حاجی صاحب مشہور صاحب خیر، مشائخ کے معتقد، اولیاے کرام کے نیاز مند، علماے اسلام سے گہری عقیدت و نیاز رکھنے والے مذہباً حنفی، مسلکاً بریلوی، حضرت شیر بیشہ اہل سنت علامہ مولانا حشمت علی خان صاحب نوراللہ مرقدہ کے مرید باصفا و معتقد خاص ہیں، بڑی تکریم و احترام کے ساتھ پیش آئے، نہایت خوش اخلاقی و خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے میری خیریت دریافت کی، میں نے مختصراً اپنی علالت اور علاج کے بارے میں کچھ باتیں بتا کر یہ کہا کہ خدائے شافی جس حالت میں رکھے وہی بہتر ہے۔

یہ دونوں برادران آپس میں بڑی بے تکلفی سے محو گفتگو ہو گئے اور ایسی زبان میں بات کر رہے تھے کہ میں ان کی باتوں کو قطعاً نہیں سمجھ رہا تھا، کافی دیر تک بات چیت کے بعد محترم جناب حاجی احمد عمر صاحب ڈوسا نے میری طرف مخاطب ہو کر یہ کہا کہ آپ ایک کتاب تصنیف فرمادیں، جس میں بینکوں سے ملی ہوئی زائد رقم کا حکم تحریر فرمائیں، اور وہ مسائل جو موجودہ عہد سے تعلق رکھتے ہیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے بھی احکام بیان فرمادیں،

میں نے حاجی صاحب موصوف سے کہا ”اس وقت میں بیمار ہوں میرا علاج چل رہا ہے، ذہنی و دماغی الجھن میں مبتلا رہتا ہوں اور چوں کہ میں ایک مشہور و معروف دارالعلوم کا صدر مدرس ہوں، اس لیے میری مصروفیتیں بھی بے حد بڑھی ہوئی ہیں، تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالنا مشکل امر ہے، البتہ آپ جیسے مخلص، ملت کے خادم کی فرمائش بایں طور پوری کرنے کی کوشش کروں گا کہ میرے شاگردوں میں بہت سے ایسے اہل علم و ارباب دانش پائے جاتے ہیں، جو اعلیٰ درجے کی علمی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان میں سے بعض فتویٰ نویسی کے کام پر مامور بھی ہیں، ان میں ایک دو کو طلب کر کے اپنی نگرانی میں ایسی کتاب کی تالیف کا کام لوں گا، لیکن میرے عزیز اہل ثروت نہیں ہیں، بلکہ معمولی مشاہروں پر دین حنیف کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اس لیے جب میں ان سے کام لوں گا تو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کی مالی خدمت بھی کرنی پڑے گی۔

حاجی احمد عمر صاحب نے بر جستہ کہا کہ اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں جو بھی اخراجات آئیں گے میں ان کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور آپ کے وہ شاگرد جنھیں آپ اس کام پر مامور کریں گے، ان کو میں ماہ بہ ماہ مشاہرہ بھی ادا کرتا رہوں گا، آپ اس کتاب کی تصنیف اور اس کتاب کی طباعت کے مصارف کا ایک تخمینہ دو تین روز کے اندر میرے یہاں ارسال فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

اپنے جن شاگردوں کے ذمے یہ اہم علمی کام لگانا ممکن تھا، ان میں سے ایک مولانا الحاج حفیظ اللہ صاحب نعیمی سلمہ استاذ دارالعلوم فضل رحمانیہ پچپڑوا گونڈہ اور دوسرے محب مکرم عزیز سعید جناب مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور تھے، ان دونوں علمائے کرام کا تعارف میں نے ان الفاظ میں کرایا کہ ” میرے یہ دونوں شاگرد بڑے لائق و فائق، نہایت نیک طینت، اسلامی علوم و فنون پر یک گونہ بصیرت و دسترس رکھنے والے، متدین عالم دین ہیں، انہیں دونوں علمائے کرام سے کام لینے کا ارادہ ہے“ حاجی صاحب نے فرمایا کہ حضرت! آپ جس سے چاہیں کام لیں یہ آپ کی مرضی پر موقوف و منحصر ہے، ہم کو تو صرف اخراجات کا تخمینہ چاہئے۔

میں حاجی صاحب کی باتوں سے بہت متاثر ہوا اور خوش خوش وہاں سے اس خیال کے ساتھ واپس ہوا کہ گویا میری علالت اور اس کے علاج کے لیے ممبئی کا سفر ایک اچھے کام اور اہم کام کے لیے بہانہ ہے، خدائے قدوس اس حقیر ناچیز سے اپنے دین کا کام لینے کی سبیل پیدا فرمارہا ہے۔

اپنی قیام گاہ (مصطفی بازار) پر واپس آیا، عزیز سعید مولانا معین الحق علیمی سلمہ ربہ سے اپنی اس ملاقات کی تفصیل بتائی اور ان کو یہ بھی بتایا کہ حاجی صاحب نے تخمینہ طلب کیا ہے اس پر وہ بھی بہت خوش ہوئے، میں نے کہا کہ ان کے سامنے کیا اندازہ پیش کروں، سمجھ میں نہیں آتا، مولانا علیمی صاحب نے کہا کہ حضرت اگر آپ اس کتاب کا کام مولانا حفیظ اللہ صاحب اور مفتی نظام الدین صاحب کو اپنے یہاں طلب کر کے لینا چاہتے ہیں خواہ یہ دو تین مہینے وقفے وقفے کر کے ہو تو ان کا تصنیفی مشاہرہ کم از کم تین ہزار روپیہ ہونا چاہئے، اس طرح دس بارہ ہزار روپئے ان کی تنخواہوں میں صرف ہوں گے اب کتاب کی کتابت و طباعت میں کیا خرچ آئے گا، میں اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا، کیوں کہ وہ کتاب کی ضخامت کے اعتبار سے متعیّن ہوگا، فی الحال آپ حاجی صاحب سے بیس ہزار روپئے کا تخمینہ بتادیں، تنخواہوں اور کتابت وطباعت کے لیے اگر یہ رقم پوری ہوجائے تو مزید طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر کم پڑ جائے تو اس کا حساب بھیج کر جو کمی ہو اس کو بلا جھجھک طلب فرمائیں، میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ بہت دیندار ،صاحب خیر، دینی کاموں سے دلچسپی رکھنے والے اور ملت اسلامیہ کے سچے خادموں میں شمار کیے جاتے ہیں، ساتھ ہی وہ علما کے قدر نواز، نیک طینت و با اخلاق مسلمان ہیں وہ فوراً آپ کی اعانت فرمائیں گے، لیکن حضرت یہ تصنیف نہایت شاندار، دیدہ زیب و دلفریب، زبان و بیان کے اعتبار سے دلچسپ اور ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہو۔

مولانا علیمی صاحب کی اصابت رائے معروف و مسلم ہے، چنانچہ ۲۷ جولائی ۱۹۹۱ء کو حاجی ابراہیم صاحب ڈوسا کے یہاں اس نیت سے گیا کہ ان کو ساتھ لے کر حاجی احمد عمر صاحب کے دولت کدے پر جاؤں گا، لیکن حاجی صاحب اپنی مصروفیت یا کسی مصلحت کی وجہ سے میرا ساتھ نہ دے سکے، میں ایک طالب علم کے ہمراہ حاجی صاحب موصوف کے بنگلے پر

پہونچ گیا، وہ کہیں گئے تھے، ابھی انتظار میں چند منٹ گذرے ہوں گے، کہ وہ واپس تشریف لائے، سلام و مصافحہ کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ حیرت انگیز اور خلاف توقع تھی۔

انھوں نے کہا کہ ضرور میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا اور کتاب کے اخراجات کا تخمینہ بھی طلب کیا تھا لیکن اب میں معذور ہوں، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ (اس گفتگو میں ان کا تیور اور طرز کلام نسبتاً بدلا ہوا تھا) انھوں نے مزید یہ کہا کہ گزشتہ روز آپ نے فرمایا تھا کہ دارالعلوم اشرفیہ کے ایک مفتی جناب مولانا نظام الدین صاحب سے یہ کتاب تصنیف کرواؤں گا اور ان کے متعلق کل ہی یہ معلوم ہوا کہ یہ وہی مفتی صاحب ہیں، جنھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس بات کی صراحت ہے کہ لاؤڈ اسپیکر استعمال کر کے نماز پڑھنا جائز ہے، دارالعلوم اشرفیہ سنّیوں کا ایک عظیم الشان ادارہ ہے جنھوں نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف یہ کہ دارالعلوم میں اختلاف و انتشار پیدا کیا ہے، بلکہ میرے مرشد برحق حضور شیر بیشۂ اہل سنت علامہ و مولانا حشمت علی خان صاحب علیہ الرحمۃ اور حضور مفتی اعظم علیہ الرحمۃ کے فتاویٰ کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی ہے، میں ایسے مفتی صاحب سے کام لینے کے حق میں نہیں ہوں۔

حاجی صاحب ایک دیندار، اللہ والوں کی بارگاہ میں اپنی نیاز و اخلاص کی پیشانی جھکانے والے اپنے مرشد برحق شیر بیشہ اہل سنت علیہ الرحمہ کے عاشق زار، بلکہ ان کے جاں نثار و فدائی تھے، ان کے لیے یہ بات بڑی غمناک و کرب ناک تھی کہ اپنی جماعت کے ایک عالم دین نے ان کے مرشد کے فتوے کے خلاف اپنی رائے ظاہر کر دی، جذباتیت اگرچہ بالعموم مستحسن امر نہیں ہوتی ہے تاہم دینی معاملات میں جن کے احساسات بیدار ہوتے ہیں اور مسائل شرعیہ میں جو اپنے مشائخ کے مسلک کے پابند ہوتے ہیں، اگر ان کے اندر ایسا جذباتی عنصر نہ پایا جائے تو گویا در حقیقت اپنی نیاز و عقیدت کی پیشانی ظاہراً جھکاتے ہیں اور باطن میں ان کا دل عقیدت و محبت سے لبریز نہیں ہوتا، اس موقع پر اگر حاجی صاحب کے بجائے کوئی دوسرا ہوتا اور وہ اپنے مرشد کا عاشق زار ہوتا تو وہ بھی مضطرب و بے قرار ہو جاتا اس لیے میرے اپنے خیال میں حاجی صاحب کی یہ بات استحسان کی نگاہ سے دیکھنے کے لائق ہے کہ علماے حق کی بارگاہ میں اتنے زیادہ نیاز مند ہیں، یہی ان کی نیاز مندی ان کی حرارت ایمانی بلکہ قوت ایمانی کو برقرار رکھتی ہے۔

جب وہ اپنی عقیدت مندانہ گفتگو سے فارغ ہو گئے تو میں چند ثانیہ تک حیرت میں ڈوبا ہوا، سکوت کے عالم میں رہا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اپنی گفتگو کیسے آگے بڑھاؤں اور کس عنوان سے ان سے بات چیت کا آغاز کروں، بجائے کچھ کہنے کے میں نے ان کی طرف دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی کا تعارفی کتابچہ پیش کیا اور صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ حاجی صاحب اگر موقع میسر آئے تو یہ چند ورقی کتاب ایک نظر ضرور دیکھ لیں، انھوں نے کہا کہ میں اس کو کیا کروں گا؟ (پھر میری طرف کتاب بڑھا کر) یہ کہا کہ اگر یہ کتاب میرے یہاں رہی تو اس کو دریا برد کر دیا جائے گا، اس گفتگو پر برجستہ میں نے ان سے یہ محاسبہ کیا کہ "دریا برد" کا لفظ کتاب کے بارے میں استعمال کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس سے اہانت کا ایہام ہو رہا ہے اور اس میں قرآن حکیم کی آیت کریمہ اور احادیث شریفہ درج ہیں، اس کے لیے یہ لفظ نہیں بولنا چاہیے، میں نے اپنے طور سے سمجھا تھا کہ شاید حاجی صاحب جذبات کی رو میں ایسا کہہ رہے ہوں، لیکن انھوں نے نہایت سنجیدگی و متانت بلکہ نرم لہجے میں کہا کہ میرا منشا وہ نہیں تھا جو آپ نے سمجھا بلکہ بات یہ ہے کہ میرے یہاں ایسی کتابیں اور کتابچے آتے رہتے ہیں جب وہ کافی مقدار میں جمع ہو جاتے ہیں، تو میں ان کو ادب و احترام کے ساتھ کپڑے میں بندھوا کر سمندر میں ڈال دیتا ہوں تاکہ یہاں رہ کر ان کی بے ادبی نہ ہو، میرے کہنے کا مقصد یہی تھا، میں نے کہا حاجی صاحب! آپ نیک اور دیندار آدمی ہیں، آپ کی زبان سے جو الفاظ نکل گئے، ان میں ایک طرح اہانت کا پہلو ضرور مضمر ہے، اس پر آپ توبہ کر لیں، تو کوئی حرج نہیں، توبہ و استغفار مومن کی شان ہے، حضور اکرم مجسم ﷺ تمام خطاؤں اور گناہوں سے محفوظ و معصوم تھے، آپ سے صغائر و کبائر کا صدور علماے حق کے نزدیک محال ہے، لیکن اس کے باوجود روایتوں میں آیا ہے کہ ایک ہی مجلس میں ستر بار استغفار پڑھا کرتے تھے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ میری مخلصانہ تنبیہ سے حاجی صاحب بہت متاثر ہو رہے ہیں، ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہو رہا تھا، کہ ان کو اپنی باتوں پر یک گونہ ندامت ہو رہی ہے، فوراً انھوں نے توبہ کیا، اور استغفار پڑھ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا، میں ان کی اس مومنانہ شان سے بہت خوش ہوا، بالعموم جن کو دنیوی وجاہت حاصل ہوتی ہے یا جو صاحب

ثروت ہوتے ہیں، اگر ان کو ان کی کسی غلط بات پر تنبیہ کی جائے تو بجائے اس کے کہ وہ اس کو قبول کریں الٹے وہ اپنی غلط بات کی توجیہ و تاویل عجیب ڈھنگ سے کرتے ہیں اور تنبیہ کرنے والے عالم دین کی تعظیم و تکریم کے بجائے ان سے متنفر ہوجاتے ہیں، لیکن ہمارے حاجی صاحب کا معاملہ اس کے برعکس رہا، ابتداءً ان کا انداز گفتگو سخت تھا، ان کے کلام سے ان کے اندرونی احساسات کی عکاسی ہورہی تھی، نرم پڑ گئے اور وہ فروتنی و خاکساری کے ساتھ مجھ سے ہم کلام ہوئے، ان کی باتوں سے یک گونہ معذرت کا احساس ہورہا تھا، یہ ان کی بلندی کی دلیل کے علاوہ ان کی دیندار روش سے بالکل ہم آہنگ تھا۔

بہر حال اس گفتگو کے بعد بڑی عزت و احترام کے ساتھ حاجی صاحب نے رخصت کیا، لیکن راستے بھر میں سوچتا رہا، کہ ابھی چند گھنٹے پیشتر میرے ذہن کے اندر یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ میری بیماری بھی ایک عمل خیر کا بہانہ بن گئی، مگر آج کے واقعے نے ثابت کردیا کہ انسان کا خیال کچھ ہوتا ہے اور خارجی دنیا میں اس کی تعبیر الٹی ہوتی ہے جو مسرت کے بجائے غم کا باعث ہوتی ہے، انھیں خیالوں میں ڈوبا ہوا اپنی قیام گاہ واپس آیا اور عزم مصمم کرلیا تھا کہ یہ عنوان اچھا ہے، اپنی بے حد مصروفیت کے باوجود میں خود ہی اس موضوع پر کام کروں گا، خواہ اس راہ میں کتنی ہی دشواریاں پیش آئیں اور چاہے میری کتاب زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکے، تاہم عزم و حوصلے کے ساتھ مطالعہ کے اسلحے سے مسلّح ہوکر اپنے اشہب قلم کو اس میدان میں تیز گام رکھوں گا، چناں چہ کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا، اس موضوع پر جتنی کتابیں مجھ کو دستیاب ہوئیں، شاید ہی کوئی کتاب ہو، جو میری نگاہ سے نہ گزری ہو، اس موضوع سے متعلق رطب و یابس باتیں بھی ملیں اور اچھی باتیں بھی، مگر میرے مطالعے کی اہم کتاب فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فتاویٰ رضویہ رہی، مسلسل علمائے کرام سے تبادلۂ خیال بھی کیا، کیوں کہ اس سے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ہمہ دانی کا جو کیڑا ذہن کے نہاں خانے میں پرورش پاتا ہے، اس کو نکال باہر پھینکنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس طرح یہ کتاب تھوڑی تھوڑی کر کے ذہن کے خلوت کدے سے صفحۂ قرطاس کی جلوہ گاہ میں آہی گئی، لیکن اب بھی یہ مسئلہ پریشان کن رہا کہ یہ کتاب منظر عام پر کیسے آئے گی؟ جتنی کچھ جاں فشانی و جاں کاہی اس حقیر

تالیف کے سلسلے میں برداشت کی گئی، اس کو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جن کو اس قسم کے کاموں کا سابقہ رہتا ہو، مختلف گلستانوں سے پھولوں کا چننا پھر اس سے ایک گلدستۂ علم تیار کرنا، وہ بھی اس حالت میں کہ قدم قدم پر کانٹوں سے دامن الجھ رہا ہو اور ہر الجھاؤ سے ذہن وفکر متاثر ہو رہے ہوں، کوئی آسان کام نہیں ہے، پھر اگر یہ پرخار وادی طے کر لی گئی ہو اور منزل مقصود پر اپنی بے دست و پائی کی وجہ سے نہ پہونچ سکا یعنی کتاب منظر عام پر نہ آئی، تو کتنی ذہنی کوفت کی بات ہوگی اور کتنے مایوسیوں کے کانٹے دامن امید سے الجھ کر عزم وحوصلے کو تار تار کر دیں گے۔

لیکن قدرت الٰہیہ ہر اس بندے کی یاوری کرتی ہے، جو نام ونمود سے بے نیاز ہو کر، بلکہ گوشۂ گمنامی میں زندگی گذاری کر دینی خدمت کا فریضہ انجام دیتا ہو، علمی دنیا میں اگر چہ مجھ کو درس و تدریس کی راہ سے تھوڑا بہت جانا پہچانا جاتا ہے، لیکن شعلہ بار مقرروں اور خطیبوں یا بلند پایہ ادیبوں اور صحافیوں کی طرح مجھ کو عوامی شہرت حاصل نہیں ہے، کچھ مخصوص حلقے مجھ سے ضرور آشنا ہیں، مگر ان سے کتاب کی طباعت کے سلسلے میں کسی اعانت کی امید رکھنا کار عبث ہے۔

یہ خدائے قدوس کی کارسازی ہے، کہ زندگی میں پہلی بار دارالعلوم محمدیہ بمبئی کے طلبہ کے امتحان کے لیے ممبئی ۱۷/شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ کو پہونچا، امتحانات اور دیگر تقریبات میں شرکت سے فراغت کے بعد خیال آیا، کہ جناب الحاج احمد عمر ڈوسا صاحب سے پھر ملاقات ہونی چاہئے، اس ملاقات کے لیے بھی ہمارے مخلص قدیم جناب محمد ابراہیم صاحب ڈوسا وسیلہ بنے، ان کے ہمراہ ۲۴/شعبان ۱۴۱۲ھ کو حاجی صاحب کے آفس میں پہونچ گیا، انھوں نے بڑی خندہ پیشانی وکشادہ روئی، بلکہ پرتپاک انداز میں اپنے اخلاق کا مظاہرہ کیا کہ اپنی کرسی چھوڑ کر اپنی جگہ بٹھانا چاہا، میں نے ان کو کرسی پر بیٹھے رہنے کی فرمائش کی، جس وقت ہم لوگ پہونچے تھے، بہت سے علمائے کرام موجود تھے، تھوڑی ہی دیر میں ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے، اب حاجی صاحب موصوف اپنی پرشکوہ عمارت کی چوتھی منزل پر مجھ کو لے گئے اور جس ادب واحترام کا مستحق میں نہیں تھا، اس کے لائق انھوں نے مجھ کو تصور کیا اور ایک

امتیازی جگہ پر مجھے بٹھایا اور خود مؤدب انداز میں میرے قریب بیٹھ گئے، وہاں انھوں نے کوئی طویل گفتگو نہیں کی، کتاب کے بارے میں کچھ باتیں دریافت کر کے یہ کہا کہ حضرت! جس کتاب کے لکھنے کا آپ سے تذکرہ ہوا تھا وہ کتاب مکمل ہوگئی یا نہیں؟ میں نے کہا کہ جلد ہی وہ تکمیل کے مرحلے میں داخل ہونے والی ہے، لیکن کتابت وطباعت اور اس کو منظر عام پر لانے کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے، انہوں نے کہا ان شاء اللہ العزیز اس دشواری کا بھی حل نکل آئے گا، یہ کہہ کر انھوں نے تمام اخراجات کی ذمہ داری قبول فرمالی۔

اس طرح سے یہ کتاب ناظرین کرام کے ہاتھوں میں پہونچ رہی ہے، اس میں کیا ہے؟ اور حقیر مؤلف کو اس موضوع پر کتنی کامیابی حاصل ہوئی، اس کا فیصلہ ایسے اہل علم پر چھوڑتا ہوں، جو کتابوں کے پڑھنے اور اس کی گہرائی میں اترنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، اب اس مقام پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حاجی احمد عمر صاحب ڈوسا نے فرمائش کی، یہی اس کتاب کا سبب تالیف بنی، اس بات کی صحت میں کلام نہیں کیا جاسکتا، لیکن میرے نزدیک اس کے سوا یہ بات بھی ہے کہ خدائے قدوس جب اپنے کسی بندے سے دین کی خدمت لینا چاہتا ہے، تو بے سروسامانی کے عالم میں بھی اسباب ووسائل پیدا فرمادیتا ہے، ورنہ میں کہاں اور کسی کتاب کی تالیف کہاں؟ میں تو درس وتدریس کا آدمی ہوں اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گذر گیا۔

دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ میری اس کتاب کو قبولیت عام عطا فرما کر مسلمانوں کو دین کے راستے پر گامزن رہنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس ناکارہ اور اس کے والدین کی بخشش کا ذریعہ بنائے، نیز حاجی احمد عمر صاحب ڈوسا، حاجی محمد ابراہیم صاحب ڈوسا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ ان حضرات کو دنیا وآخرت میں سرخرو رکھے اور ان کے عمل نیک اور حسن نیت کی بہترین جزا عطا فرمائے، آخر میں دعا ہے کہ رب کریم ان دونوں صاحبان کے والدین مرحومین کی قبروں کو رحمت ونور سے بھر دے اور آخرت میں ان کو بلند مقام عطا فرمائے۔ فقط

عبد اللہ خاں عزیزی

۷/ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ بروز جمعرات خادم دار العلوم علیمیہ جمداشاہی، بستی، یوپی انڈیا

باب اول

الحمد للہ و کفی و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ،اما بعد!

سود کی حرمت کے چار ادوار

خدائے قدوس جب اپنے بندوں پر کسی ایسی چیز کو حرام کرنا چاہتا ہے جو سماج میں چہار جانب پھیلی ہوئی ہو اور جس کی جڑیں بہت گہرائی تک گئی ہوئی ہوں تو اس کی سنت یہ ہے کہ پہلے اس کی حرمت و ممانعت کے لیے ذہنوں کو تیار کرتا ہے، اس کے مفاسد اور خرابیوں کو بیان کر کے اس کے لیے تنفرّ و حقارت کا جذبہ پیدا کرتا ہے، یہی اسلوب حکیمانہ خدائے قدوس نے سود کے بارے میں پسند فرمایا، چناں چہ سود کی مذمت و حرمت کو چار ادوار میں قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے، اس لیے انہیں ادوار کے اعتبار سے ہم ان آیات الٰہیہ کو ذکر کرتے ہیں جو سود کے بارے میں نازل کی گئیں۔

دور اول

مکہ مکرمہ میں یہ پہلی آیت سود کے بارے میں نازل ہوئی۔

وَمَآ ءَاتَيۡتُم مِّن رِّبٗا لِّيَرۡبُوَاْ فِيٓ أَمۡوَٰلِ ٱلنَّاسِ فَلَا يَرۡبُواْ عِندَ ٱللَّهِۖ وَمَآ ءَاتَيۡتُم مِّن زَكَوٰةٖ تُرِيدُونَ وَجۡهَ ٱللَّهِ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُضۡعِفُونَ۔

[سورہ روم:۳۹،پ۲۱]

ترجمہ: اور تم جو چیز زیادہ لینے کو دو کہ دینے والے کے مال بڑھیں تو وہ اللہ کے یہاں نہ بڑھے گی اور جو تم خیرات دو اللہ کی رضا چاہتے ہوئے تو انہیں کے دونے ہیں۔

یہ پہلی آیت کریمہ ہے جو سود کے بارے میں نازل ہوئی ,اس میں معمولی مذمت پر اکتفا کیا گیا اور صرف یہ بتایا گیا کہ اللہ کے نزدیک سود کوئی اچھی چیز نہیں ہے، تم اپنے خیال سے یہ سوچتے ہو کہ اس سے مال میں اضافہ ہو گا، یقین رکھو اس سے دولت میں زیادتی نہیں ہوگی، بلکہ اس خیرات سے تم زیادہ حاصل کرو گے جو خلوص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے ہو، یہ محض ایک نصیحت تھی بس۔

دور ثانی

اس دور میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ ٱلَّذِينَ هَادُواْ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ كَثِيراً وَأَخْذِهِمُ ٱلرِّبَا وَقَدْ نُهُواْ عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَاطِلِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَاباً أَلِيماً۔[سورہ نساء: ۱۶۰۔۱۶۱، پ۶]

ترجمہ : تو یہودیوں کے بڑے ظلم کے سبب ہم نے وہ بعض ستھری چیزیں کہ اُن کے لیے حلال تھیں اُن پر حرام فرمادیں اور اس لیے کہ انہوں نے بہتوں کو اللہ کی راہ سے روکا اور اس لیے کہ وہ سود لیتے حالاں کہ وہ اس سے منع کیے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے اور ان میں جو کافر ہوئے ہم نے اُن کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یہ سورۂ نسا مدنیہ کی آیت کریمہ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بیان کیا کہ یہودیوں پر سود کو حرام کر دیا گیا تھا، لیکن اس سے وہ باز نہیں آئے بلکہ اس کو کھاتے رہے، اس کی وجہ سے ان پر عتاب الٰہی نازل ہوا کہ اتنی پاک چیزیں ایسی تھیں جو ان کے لیے حلال تھیں مگر ان پر حرام کر دی گئیں اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہوئے، سورۂ روم کی مذکورہ آیت اور سورہ نسا کی اس آیت کے تیور میں بڑا فرق نظر آرہا ہے، اس آیت کریمہ سے جھلک رہا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ سود کو حرام کر دیا جائے گا کیوں کہ یہودیوں کے جرائم کی فہرست میں سود خوری کو بھی شمار کیا گیا ،اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس جرم سے مسلمانوں کو بھی احتراز کرنا چاہیے، لیکن واضح طور سے سود کی حرمت نہیں بیان کی گئی بلکہ کلام کا رخ دوسرے لوگوں کی طرف پھر اشارہ سود کی

حرمت کی طرف کیا گیا، تاکہ ناگہانی امتناع کلی سے مسلمان انتشار ذہنی میں مبتلا نہ ہوں۔

دور ثالث

اس دور میں سورۂ آل عمران کی آیت کریمہ نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ [آل عمران: ۱۳۰، پ۴]

ترجمہ: اے ایمان والو! سود دونا دون نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو اس امید پر کہ تمھیں فلاح ملے۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے سودی مظالم عام تھے، اگر ایک مرتبہ اپنے کسی شکاری کو سود کے جال میں پھانس لیتے، تو اس کے لیے اس سے رہائی ناممکن ہوجاتی تھی، ایسی سود خوری کے ماحول میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور مسلمانوں پر سود کو حرام قرار دیا گیا اور ان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ سود خوری کی اس لعنت سے جس میں یہودی ساہوکار گرفتار ہیں اپنے کو بہت دور رکھو لیکن ابھی تک مکمل طور سے سود کی حرمت کا بیان نہیں ہے۔

دور رابع

اس دور میں سورہ بقرہ کی یہ سات آیتیں نازل ہوئیں۔

① الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۷۵﴾	وہ جو سُود کھاتے ہیں قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنادیا ہو، یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا بیع بھی تو سُود ہی کے مانند ہے اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سُود تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا تو اسے حلال ہے جو پہلے لے چکا اور اس کا کام خدا کے سپرد ہے اور جو اب ایسی حرکت کرے گا وہ دوزخی ہے وہ اس میں مدتوں رہیں گے،

۲ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

اللہ ہلاک کرتا ہے سُود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گنہگار،

۳ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

بے شک وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکٰوۃ دی اُن کا نیگ ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم۔

۴ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود اگر مسلمان ہو۔

۵ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

پھر اگر ایسا نہ کرو تو یقین کر لو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا اور اگر تم توبہ کرو تو اپنا اصل مال لے لو نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ نہ تمہیں نقصان ہو۔

۶ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

اور اگر قرض دار تنگی والا ہے تو اسے مہلت دو آسانی تک اور قرض اس پر بالکل چھوڑ دینا تمھارے لیے اور بھلا ہے اگر جانو۔

۷ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھرو گے اور ہر جان کو اس کی کمائی پوری بھر دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہو گا۔

۔[البقرۃ: ۲۷۵، ۲۸۱، پ۳]

یہ سورۂ بقرہ کی وہ آیات ہیں جن سے نہ صرف سود کو ممنوع قرار دیا گیا، بلکہ مختلف

اسلوب اور بلیغ طرز بیان سے حرمت کے ساتھ ساتھ وعیدیں بھی نازل کی گئیں، بعض مفسرین کے بقول یہ آیتیں سن ۸ھ میں نازل ہوئیں، اب اس کی تحریم کا مرحلہ مکمل ہوگیا، کسی طرح کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی، کہ کوئی شخص سودخوری کا جواز پیدا کرے، ہر حال میں قلیل وکثیر سود کو حرام قرار دیا گیا، مگر یہ کہ کوئی اضطراری صورت پیدا ہوجائے۔

پہلی آیت کریمہ:

سود خور کی یہ حالت بیان کی گئی کہ میدان محشر میں وہ اس طرح اٹھے گا کہ جیسے کہ آسیب زدہ چلتا ہے، کبھی لڑکھڑاتا ہے کبھی اس کے قدم ڈگمگاتے ہیں، کبھی حواس باختگی میں ادھر ادھر کے چکر لگاتا ہے، کبھی دو قدم آگے بڑھتا ہے اور ٹھٹھک کر رک جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک سود خور کی بھی چال ہوگی، وہ اپنی سود خوری کی ہوس کی بنیاد پر دنیا میں اپنی عقل سے بے گانہ ہوکر عجیب وغریب حرکتیں اپنی ہوائے نفس کے لیے کرتا تھا اور اس کی فطرت سلیمہ کی اعتدالی کیفیت ختم ہو گئی تھی، اسی طرح وہ آخرت میں بھی عذاب الٰہی کی وجہ سے عجیب و غریب دہشت ناک حالت میں مبتلا ہوگا، وہ پاگل نہ ہوگا لیکن پاگلوں جیسی حالت ہوگی، اس کی یہ حالت کیوں ہوگی؟۔

سود خور کی مخبوط الحواسی کا بیان

اس کی یہ حالت اسی لیے ہوگی کہ اس نے دنیا میں اپنی سود خورانہ ذہنیت کی تسکین کے لیے قیاس کیا تھا کہ سود بھی تو خرید وفروخت کی طرح ہے، لیکن اس کو بطور مبالغہ الٹ کر یہ کہا تھا کہ خرید فروخت بھی سود کی طرح ہے، یعنی تجارت میں بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ نفع کمایا جائے، اشیا کے مبادلے سے کچھ نہ کچھ زیادتی مقصود ہوتی ہے، تو سود لے کر اگر زیادتی حاصل کی جائے یا نفع کمایا جائے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اگر کوئی شخص پچیس روپئے لے کر بازار سے کوئی سودا لائے پھر اس کو پچاس روپیہ میں بیچ کر کے نفع حاصل کرسکتا ہے تو یہی پچاس روپیہ دے کر براہ راست پانچ روپیہ زیادہ کیوں نہیں لے سکتا؟ سود خوروں کے اس قیاس کو قرآن حکیم نے باطل قرار دیا، یہ قرون مظلمہ کے سود خور تھے، جو اس قسم کی جاہلانہ

دلیل پیش کرتے تھے، لیکن اس قرن منور میں بھی ہوش و خرد کے دعوے دار اور علم و فن میں باکمال ہونے کے مدعی بھی اس قسم کا قیاس پیش کرتے ہیں، قرآن حکیم نے اس قیاس کے بطلان پر کوئی منطقیانہ دلیل نہیں قائم کی بلکہ اپنے حکیمانہ انداز میں ارشاد فرمایا" و احل اللہ بیع و حرم الربو"۔اور اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا، تو پھر کیسے دونوں یکساں ہوسکتے ہیں، کیوں کہ خدا کی ذات پاک حکمت والی ہے، ناممکن ہے کہ دو چیزوں میں مکمل یکسانیت کے باوجود دونوں کا حکم جدا گانہ ہو، سود اور تجارت کے احکام جب مختلف ہوگئے تو اسی سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ دونوں میں بہت فرق ہے، مگر اس زمانے کے کفار اور اس عہد کے سود خور ناہنجار دونوں اس بات کو سمجھ نہیں پاتے کہ کوئی کاروبار ہو یا کوئی تجارت آدمی اس میں اپنی محنت اور دولت یا محنت اور دولت دونوں صرف کرتا ہے، اس میں اس کو کچھ نہ کچھ نقصان کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے یعنی اس کو کسی مقررہ منافع کی ضمانت نہیں ہوتی ہے، لیکن سود پر قرض دینے والا یا سودی کاروبار کرنے والا ایک ایسا نفع خور ہے کہ اس کو کبھی بھی نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا ہے اور لازماً اس کو ہمیشہ اپنے سرمایے یا اپنے راس المال سے زائد رقم ملتی رہتی ہے۔

اس سے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ تجارت اور سودی کاروبار میں کتنا عظیم فرق ہے، اور دونوں میں کسی طرح کی یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے، ایک تو تہذیب و تمدن کے فروغ کے لیے ضروری ہے، ایک تو انسانی معیشت کے لیے نہایت اہم ہے، جس کے بغیر مراحل حیات میں اجتماعی زندگی کے دروازے بند ہوجاتے ہیں، اور دوسرا انسانوں کی معیشت کی ناہمواری کا ذریعہ ہے، اور اجتماعی زندگی کے ستونوں کو کھوکھلا کر دینے والا ہے، ایک اخلاق و مروت، انسانی شرافت و خیر خواہی کے جذبات کو فنا کر دینے والا ہے، دوسرا باہمی الفت و مروت، ایک دوسرے سے میل ملاپ پیدا کر دینے کا سبب ہے، اس لیے دونوں یکساں کیسے ہوسکتے ہیں؟

تجارت اور سود میں فرق اتنا واضح تھا کہ قرآن حکیم میں اس کو قابل اعتنا نہیں بتایا گیا کیوں کہ ادنیٰ غور و خوض سے سود کے مفاسد اور خرابیاں واضح ہوجاتی ہیں۔

دوسری آیت کریمہ:

اس آیت میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ سود سے گو بظاہر مال میں اضافہ نظر آتا ہے تاہم اپنے نتائج کے اعتبار سے مال کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے، اور صدقات و خیرات سے مال میں اضافہ ہوتا ہے، اگر اخلاقی اعتبار سے غور کیا جائے تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ سود انسان کے اندر جو صفات رذیلہ پیدا کرتا ہے وہ قوموں اور جماعتوں کے درمیان منافرت کا باعث ہوتی ہیں، اس سے اگر ایک طرف قارون صفت افراد پیدا ہوتے ہیں جن کے یہاں دولت و ثروت کا انبار لگا رہتا ہے تو دوسری جانب افلاس و تنگ دستی کو عروج حاصل ہوتا ہے، جس سے طبقاتی جنگ اور باہمی کش مکش کی راہ ہموار ہوتی ہے جس کا نتیجہ سوائے ہلاکت و بربادی کے کچھ نہیں ہوتا ہے۔

آپ معاشی حیثیت سے غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سود کی دو قسم ہے: ایک تو وہ سودی قرض جو ذاتی ضرورت کے لیے حاجت منداور مجبور لیتے ہیں، دوسرا وہ سودی قرض جو صنعت و حرف اور تجارت و زراعت کے کاموں میں لگانے کے لیے لیا جاتا ہے، پہلی قسم کا سود ظاہر ہے کہ اس سے دولت میں کیسے اضافہ ہوگا، سود کا یہ طریقہ بڑا دردناک اور تباہ کن ہوتا ہے، دنیا کے تمام ممالک میں مہاجن اور مہاجنی ادارے، نیز بینک اس کے ذریعہ غریب مزدور اور کاشت کاروں کا خون چوستے ہیں، سود کی وجہ سے اس قسم کا قرض ادا کرنا سخت مشکل ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے، ایک قرض کو ادا کرنے کے لیے دوسرا اور تیسرا قرض لینا پڑتا ہے جس سے انسان اپنی بے بسی کی موت مر جاتا ہے، باقی دوسری قسم کا سودی قرض جو کاروبار میں لگانے کے لیے لیا جاتا ہے اس کے نقصانات بھی بہت ہیں۔

ا۔ جن کاموں کے لیے سود پر سرمایہ ملتا ہے خواہ وہ تجارتی کام ہو یا صنعتی یا زراعتی ان میں سے کوئی بھی کام ایسا نہیں ہے کہ جس میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ ہمیشہ تمام حالات میں اس کے منافع ایک مقررہ مدت میں مثلاً پانچ، چھ فیصد یا دس فیصد رہے گا، اس سے اوپر ہی رہے گا کبھی اس سے نیچے نہیں گرے گا، اس کی ضمانت ہونا تو درکنار کسی کاروبار میں سرے سے اس

بات کی ضمانت موجود نہیں کہ اس میں ضرور منافع ہو گا کبھی نقصان نہ ہو گا۔
۲۔ دوسری بات، چوں کہ سرمایہ دینے والا کاروبار کے نفع و نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ صرف منافع اور وہ بھی ایک مقررہ شرح منافع کی ضمانت پر روپیہ دیتا ہے اس وجہ سے کاروبار کی بھلائی و برائی سے اس کو کسی قسم کی دل چسپی نہیں ہوتی، اور انتہائی خود غرضی کے ساتھ صرف اپنے منافع پر نظر رکھتا ہے، اور جب کبھی اس کو اندیشہ لاحق ہوجاتا ہے کہ منڈی پر کساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنا روپیہ کھینچنے کی فکر کرتا ہے، اس طرح تو کبھی محض اس کے خود غرضانہ اندیشوں ہی کی بدولت دنیا پر کساد بازاری کا واقعی حملہ ہوجاتا ہے اور کبھی اگر دوسرے اسباب سے کساد بازاری آگئی تو سرمایہ دار کی خود غرضی اسے بڑھا کر انتہائی تباہ کن حد تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ تمام نقصانات جن کو جدت پسند مفکرین بیان کرتے ہیں اگرچہ فی الواقع صحیح ہو تاہم اس کا تعلق اس آیت کریمہ سے واضح نہیں ہو رہا ہے، اس لیے میرے نزدیک ان مفسرین کرام کی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آخرت میں سود کا مال اس کے کام نہ آئے گا بلکہ یہی سودی دولت اس کے لیے وبال جان ہوگی، اور اس کی وجہ سے عذاب الیم میں گرفتار ہو گا، اور خیرات کرنے والوں کا مال ابدی سرور و راحت کا ذریعہ ہو گا، لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ سود کے برے اثرات و نتائج دنیا میں کبھی نہیں ظاہر ہوں گے، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے اس سے دنیا میں بھی بسا اوقات تباہی کے آثار مشاہدے میں آتے ہیں، جس مال میں سود شامل ہوتا ہے بعض اوقات وہ خود ہلاک ہوجاتا ہے جیسا کہ سٹہ کے بازاروں میں اس کا مشاہدہ آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ بڑے بڑے کروڑ پتی سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے مفلس اور پیسے کے محتاج ہوجاتے ہیں، یقیناً بے سود کی تجارتوں میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے، لیکن ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کروڑ پتی ہو اور چند گھنٹے کے بعد ایک ایک دانے کا محتاج ہوجائے، یہ صرف سود اور سٹہ کے بازاروں میں ہوتا ہے، بہر حال سود کا مال کتنا ہی بڑھ جائے وہ باقی نہیں رہتا، چناں چہ مشہور تابعی حضرت معمر نے فرمایا کہ سود خور

کے اوپر چالیس سال نہیں گزر پاتے کہ اس کے اوپر آفت الٰہی آجاتی ہے، بالفرض مال ضائع و برباد نہ ہو تو اس میں خدا کی جانب سے کوئی برکت نہیں ہوتی ہے، بلکہ جیسے بے تحاشا آتا ہے ویسے ہی وہ خرچ ہو کر سود خور کی بے عزتی اور اس کی ذلت و خواری کا باعث ہوتا ہے، یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں کہ روپیہ پیسہ سونا چاندی نہ بالذات سود ہوتے ہیں اور نہ کارآمد اس سے کسی کی بھوک مٹ سکتی ہے اور نہ پیاس، سردی اور گرمی میں یہ بذات خود بچاؤ کا ذریعہ نہیں بنتے بلکہ یہ ایسے وسائل ہیں کہ انسان ان سے اپنے آرام و آسائش کی چیزوں کو حاصل کرتا ہے اور اس کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ آرام و راحت کی چیزیں جس طرح سے اس کو حاصل ہیں اس کی آل اور اولاد کو بھی حاصل رہیں، لیکن یہی مال و دولت، یہی سونا چاندی سود خور کی ذہنی خلش اور الجھن کا باعث ہوتے ہیں، نہ اس کو عزت و آرام کی زندگی ملتی ہے نہ اس کی اولاد کو، اس لیے اگرچہ دولت کی فراوانی اور مال و متاع کا ڈھیر لگا ہوا ہو، تاہم اس کی دولت گویا یوں گھٹ رہی ہے کہ اس کو عزت و آرام کی زندگی نہ ملی نہ راحت و سکون کی زندگی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: " ان الربا و ان کثر فان عاقبته تصیر الیٰ قل "سود اگرچہ زیادہ ہو جائے مگر انجام کار میں وہ قلت کا باعث ہے۔ [مشکوٰۃ شریف ص۲۴۶ بحوالہ ابن ماجہ و بیہقی]

تیسری آیت کریمہ:

نیک کردار مسلمانوں اور زکوٰۃ دینے والوں کو یہ بشارت دی گئی کی انہوں نے جو کچھ نیک کام کیے ہیں اس کا صلہ ان کو مل کر رہے گا، اور صرف اجر و ثواب ہی نہیں ملے گا بلکہ ایسی ابدی راحت و آسائش ملے گی کہ ان کو کوئی ڈر ہو گا اور نہ وہ کبھی رنجیدہ و غمگین ہوں گے، گذشتہ آیتوں میں جب سود خوروں کو سخت تہدید کی گئی اور ایسے لوگوں کو جو سود کو حلال سمجھ کر لیتے ہیں ان کو دائمی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے، تو اب مسلمانوں کو راحت و سرور کی بشارت سنائی گئی، کیوں کہ قرآن حکیم کا اسلوب ہے کہ اگر ایک طرف بدکرداروں کو جہنم کے عذاب کی دھمکی دیتا ہے تو دوسری طرف نیکوکاروں کو محروم نہیں رکھتا بلکہ ان کو اجر و ثواب کا مستحق بتاتا ہے، گویا اس آیت کریمہ میں بتایا گیا کہ شیوۂ ایمان سے بعید ہے کہ کوئی مسلمان سود جیسی نجاست میں

آلودہ ہوجائے اس کے لیے توزیبا یہی ہے بلکہ اس پر لازم ہے کہ اچھے کام بجالائے۔اور نماز کا اہتمام کرے نیز زکوٰۃ ادا کرے،اگر یہ سب خوبیاں کسی میں پیدا ہوگئیں تو ظاہر ہے کہ وہ سود جیسی لعنت میں گرفتار نہیں ہوسکتا، جو شخص اللہ پر ایمان رکھے گا اور اچھے کام کرے گا وہ سود جیسے برے کام میں کیسے ملوث ہوگا، جو نماز ادا کرے گا، زکوٰۃ بھی دیتا رہے گا، بھلا اس کے اندر سود خوری کی نفسانیت پیدا ہوسکتی ہے؟ جب وہ طہارت باطن کرکے اپنے دل سے مال کی محبت یوں ضائع کرتا ہے کہ وہ راہ خدا میں بے دریغ صرف کرتا ہے تو کیسے سوچا جاسکتا ہے کہ ایسا شخص سود کی لعنت میں گرفتار ہوکر وعید الٰہی کا مستحق ہوجائے۔

چوتھی آیت کریمہ

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو زبردست تہدید کی گئی ہے کہ اگر تحریم کے بعد تم نے اپنا قرض وصول کرلیا تو گویا تم مومن ہی نہیں ہو، تمھارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ تمھارا سودی مال باقی رہ گیا ہے اس وقت ان کو چھوڑ دو، ورنہ ہوسکتا ہے کہ اسلام کی دولت بے بہا سے تہی دامن ہوکر تم خائب و خاسر ہوجاؤ، اس آیت کریمہ کو غور سے پڑھیے، بار بار پڑھیں، کتنی سخت وعیدیں ہیں، ایسا محسوس ہورہا ہے برکت الٰہی اس وقت پیدا ہوگی جب کہ سود کی بقیہ رقم کو بھی چھوڑ دیا جائے، ظاہر ہے جب بقایا رقم کے وصول کرنے پر پابندی عائد کردی جائے گی اور پابندیاں اس انداز سے عائد کی گئیں کہ اگر تم نہیں چھوڑو گے تو ہوسکتا ہے کہ خود اسلام تم کو چھوڑ دے۔

اللہ اکبر! جب بقایا کے لیے اتنی تہدید تو جو سود لینے والے ہیں ان کا حشر وانجام کیا ہوگا، اس کی حقیقت تک رسائی یا اس کا صحیح ادراک ایک انسان خاکی کیسے کرسکتا ہے؟ یہ خاک کا پتلا ہے، جلال ربانی کا ادراک کرنے سے یا صحیح اندازہ لگانے سے بہت قاصر ہے۔

پانچویں آیت کریمہ :

یہ آیت کریمہ اعلان جنگ ہے، الٹی میٹم ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان کے خلاف، ان باغیوں کے خلاف جو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سود لینے سے

یا بقایا رقم وصول کرنے سے نہ رکے نہ باز آئے، تو جنگ کا اعلان انہی لوگوں کے خلاف کیا جاتا ہے جو نہ صرف قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ بار بار تنبیہ و نصیحت کے بعد فرمان شاہی کی خلاف ورزی میں لگے رہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سود خور باغیوں کے خلاف جو اعلان جنگ ہوا ہے اس کی لڑنے والی فوج کون ہوگی؟ یا آسمانوں سے فرشتے اتریں گے جو زمین پر رہنے والے باغیوں کو تہس نہس کر دیں گے یا زمین پر ہی ایسی فوج موجود ہے؟ اور اس کے رسول کے دین کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی، بالکل واضح ہے، اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ سود خور سرکشوں سے لڑنے والی کوئی غیبی قوت ہی ہوگی، غیبی قوت بھی ہو سکتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مسلمان جو اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں ان پر لازم ہے کہ ایسے نظام معیشت کے خلاف اپنی عملی قوت کا مظاہرہ کریں جس میں سود کا دور دور تک دور دورہ ہو، جہاں کہیں سود خوروں کی منظم جماعت ہو ان کے خلاف اپنی طاقتوں کو تسلیم کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کریں، کہ سود ایک ظالمانہ حرکت ہے اور ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے وفاداروں کو بھرپور کوشش کرنی چاہیے، اس لیے خداوند قدوس ارشاد فرماتا ہے کہ تم کو اس طرح سے زندگی گزارنی چاہیے کہ تم کسی پر ظلم نہ کرو اور نہ تمھارے اوپر ظلم ہونا چاہیے، یعنی ظالمانہ مظلومانہ دونوں قسم کی زندگیوں سے تم کو بیزار رہنا چاہیے، اس آیت کریمہ میں اتنی بڑی تہدید ہے کہ شاید ہی کسی منکر ممنوع پر اتنی بڑی تہدید آئی ہو، اس لیے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ اس آیت کے اندر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سود خور کا خاتمہ نہایت ہولناک اور بدترین ہوگا۔

چھٹی آیت کریمہ:

اس آیت کریمہ میں مقروض کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا کہ جب تک وہ خوشحال نہ ہو اس کے اوپر جبر و زیادتی نہ کرو بلکہ اس کو مہلت پر مہلت دیے جاتے رہو، اگر تمھارا جذبہ ترحم بیدار ہو جائے تو تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ بار قرض سے اسے سبکدوش کر کے معاف کر دو، ایک ایسے سودی ماحول میں جہاں کوئی ایک حبہ اپنے فائدے کے بغیر دینے کے لیے تیار نہ ہو وہاں تلقین و ہدایت کہ "مہلت دیتے رہو" نہیں! نہیں صرف مہلت

ہی نہ دوبلکہ سرے سے قرض معاف کردو، یہ سود خور کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ہے، کہاں اس کی بے رحم سرشت ہے؟ کہاں صدقے کی فطرت نیک؟ کہاں اس کی حرص وطمع؟ کہاں اس کا ایثار وقربانی؟ دونوں میں کوئی نسبت ہے؟ایک کی فطرت برائیوں سے بھری ہوئی اور دوسرے کی طبیعت مکارم اخلاق کا مجموعہ، اسی لیے رازداران شریعت نے فرمایا کہ سود اور صدقے میں تضاد ہے، کیسا تضاد؟ ظلم و عدل کا تضاد، آگ اور پانی کا تضاد، اجالے اور اندھیرے کا تضاد، کیوں کہ جب صدقے کا جذبہ ترحم ابھرے گا یا بلفظ دیگر ایثار وقربانی کا سورج طلوع ہوگا توظلم اور سود کی تاریکی کافور ہوگی، اس لیے خداے پاک نے سود کی حرمت کی آیتوں میں اس آیت کریمہ کو بھی پرو دیا تاکہ بندوں کو معلوم ہوجائے کہ ہر جائز وناجائز طریقہ سے دولت کو اکٹھا کرنا بھلائی اور نیکی کا کام نہیں ہے بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ اپنی دولت حاجت مندوں کو دے کران کو مہلت دواگر مہلت سے کام نہ چلے توان کو صدقہ کردو یعنی معاف کردو تمھارے حق میں یہ بہتر ہے۔

دیکھیے اسلامی تعلیم کتنی بلندی سے اپنے پیروؤں کو یہ ہدایت کرتی ہے کہ سود جیسی نجس چیز کے قریب تم کو نہیں جانا چاہیے بلکہ قرض دے کراپنے مقروض کو مہلت دو اور اس کو راس المال بخش دو یہی تمھارے لیے بہتری کا ذریعہ ہوگا اگر تم اس حقیقت کا ادراک کرسکو۔

ساتویں آیت کریمہ :

اگر قانون کی گرفت ڈھیلی ہو تو برائیوں کا انسداد ناممکن ہے، اگر انسان کو اپنے اعمال کا کوئی محتسب نظر نہ آئے تو وہ محض اپنے ضمیر کی آواز پر غلط کاریوں سے باز نہیں رہ سکتا، اسی لیے خداے قدوس نے مکافات عمل کا قانون جاری فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ اس دن سے ڈرو جس دن میں تمھیں احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضری دینی ہوگی، ہر نفس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

آیات تحریم سود میں اس آیت پاک کو خداے قدوس نے شامل کیا تھا کہ سود خوروں پر یہ بات واضح کردی جائے کہ ممکن ہے اس دنیا میں آپ سودی مظالم کی سزاؤں سے بچ جاؤ لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تمھیں تمھارے کرتوتوں کی سزا ضرور ملے گی، اس لیے کہ

خدائے قدوس کے یہاں انصاف کا ترازو قائم ہوگا، وہاں مظلوموں کی داد رسی ہوگی، تمہیں ان ظالمانہ حرکتوں کی سزائیں بھگتنی ہی پڑیں گی، لہٰذا اب بھی وقت ہے، باز آجاؤ اور سود جیسی معصیت سے توبہ کرو اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔

معارف آیات کا خلاصہ:

یہ سات آیتیں ہیں، ان میں جلال الٰہی کا پہلو غالب، لیکن ایسا نہیں ہے کہ جمال کی جلوہ آرائیوں کی جھلک نہ پائی جاتی ہوں، ضرور جمال کا بھی پہلو ہے، لیکن ان آیات کریمہ میں قہر وجلال کا سمندر موج زن ہے، کہیں سود کی حرمت پر آخری مہر لگائی گئی اور کسی آیت میں سود خوروں کی عجیب وغریب حالت کا بیان ہوا، ان کی مخبوط الحواسی کا بیان ہوا، اور یہ بھی بتایا گیا کہ اگر سود خوری حلال جان کر ہوئی تو خلود فی النار کی سزا ملے گی، یعنی دائمی عذاب کا سامنا کرنا ہوگا، پھر اس خام خیالی پر متنبہ کیا گیا کہ سود سے مال میں اضافہ ہوتا ہے، یہ فریب نظر ہے، کج فہمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ سود سے تباہی اور ادبار کے دروازے کھلتے ہیں، ہاں ہاں صدقات و خیرات باعث خیر وبرکت ہیں، آگے بڑھ کر تیسری آیت میں نیک کردار مسلمانوں کو یہ نکتہ سمجھایا گیا کہ اگر تم ممنوعات ومحرمات سے بچ کر کار خیر میں سرگرم رہے تو تم ہر حالت میں بے خوف رہوگے اور تم غمگین واداس نہ ہوگے، پھر تقویٰ وپرہیزگاری کی راہ پر گامزن رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ جو کچھ سود کا بقایا ہو خیر اسی میں ہے کہ اس کو جلدی چھوڑ دو، اگر ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ایک جنگ عظیم کا یقین کرو، کیوں کہ خداوند قدوس ظالمانہ نظام کو کسی حالت میں پسند نہیں کرتا، البتہ اگر تم نے توبہ کی راہ اختیار کی یعنی جو کچھ تمھارا سود باقی رہ گیا تھا اس کو تم نے چھوڑ دیا تو تمھارا اصل سرمایہ تم کو ضرور ملے گا، ہاں اس بات کو بھی یاد رکھو کہ خدا نے جب تمہیں دولت دی تو اپنی دولت سے حاجت مندوں کی مدد ضرور کرو، اور ان کو قرض دے کر مہلت پر مہلت دیتے رہو تا آں کہ خوش حال ہوجائیں، لیکن اگر شومی قسمت سے تمھارے قرض کی ادائگی کے لیے ان میں سکت نہ ہو تو آگے بڑھ کر اپنے ایثار وقربانی کا ثبوت پیش کرو، کہ بار قرض سے ان کو سبکدوش کر دو، آخری

آیت میں یہ ارشاد ربانی ہوا کہ اگر دنیاوی قانون کی گرفت سے تم بچ بھی جاؤ تو اس دن سے ڈرو جس دن تمام برے کاموں کی سزا ملے گی۔

یہ ہے آیات کے معارف و نکات کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ، اسی کے آئینے میں سود کا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے کہ کتنا بدنما، کتنا ڈراؤنا، کتنا خوفناک، کتنا وحشت ناک ہے یہ۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

باب دوم

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ قرآن حکیم کی آیات کریمہ کے معانی و مفاہیم کی ہلکی جھلکیاں تھیں اب آئیے حدیث شریف کے آئینے میں سود خور کو دیکھیے۔

خون کا دریا

حضور ﷺ نے اپنے رویاے صادقہ کے واقعات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

حتی اتینا علی نھر من دم فیه رجل قائم و علی شط النھر رجل بین یدیه حجارة، فاقبل الرجل الذی فی النھر، فاذا اراد ان یخرج رمی الرجل بحجر فی فیه، فرده، حیث کان، فجعل کلما جاء لیخرج رمی فی فیه بحجر، فیرجع کما کان۔[صحیح البخاری،ج :1 ،ص :28 باب اکل الربا وشاھده و کاتبه ،قدیمی کتب خانه]

یہاں تک کہ ہم ایک خون کے دریا کے کنارے پہنچے جس میں ایک آدمی کھڑا تھا اور اس دریا کے ساحل پر ایک دوسرا آدمی تھا اس کے سامنے پتھر پڑے ہوئے تھے پھر وہ شخص جو دریا میں تھا تھک کر (گھبرا کر) جب اس سے نکلنے کا ارادہ کرتا ہے تو ساحل پر کھڑا آدمی اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے تو لوٹ کر وہیں چلا جاتا ہے جہاں سے آیا تھا ایسے ہی جب وہ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے تو پتھر سے اس کے منہ پر مار پڑتی ہے اور لوٹ جاتا ہے۔

رویاے صادقہ میں بہت سے خطا کاروں نافرمانوں کی سزاؤں کے مناظر پیش کیے گئے تھے، آپ کے ہمراہ جبرئیل امین اور میکائیل علیہما السلام بھی ہوتے ہیں بد کاروں، زنا کاروں، جھوٹوں کی اندوہناک سزائیں آپ کو دکھائی جاتی ہیں، آپ فرشتوں سے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ یہ کون ہیں ؟لیکن یہ فرشتے ابھی ان لوگوں کو نہیں بتاتے ہیں، آخر میں آپ کے سامنے یہ منظر لایا جاتا ہے کہ خون کے دریا میں اک شخص تیر رہا ہے اور ساحل پر ایک دوسرا آدمی کھڑا ہے، جب پہلا والا شخص تھک کر ساحل کے قریب آکر خون کے دریا سے نکلنا چاہتا ہے تو ساحل پر کھڑا آدمی اس کے منہ پر زور سے پتھر مارتا ہے اور یہ سزائیں جاری رہتی ہیں، ابھی دونوں فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتاتے ہیں کہ کون شخص ہے جو خون کے دریا میں گرتا ہے اور بار بار اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کی پٹائی ہر بار

ہوتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ ضرب شدید اس کے منہ پڑ رہی ہوتی ہے، آخر میں حضور اکرم ﷺ کے سوال کا جواب یہ فرشتے دیتے ہیں:والذی رأیته فی النهر اکلو الربوٰ۔یعنی وہ آدمی جس کو آپ نے دیکھا کہ خون کے دریا میں تیر رہا ہے وہ سود خور ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام جو کچھ خواب دیکھتے ہیں وہ پراگندہ خواب نہیں ہوتے، عام انسانوں کی طرح ان کا خواب نہیں ہوتا کہ خارج میں اس کا کوئی مصداق نہ ہو، بلکہ انبیاے کرام کا خواب واقعات کی صحیح عکاسی کرتا ہے اور وہی کچھ دیکھتے ہیں جو خارج کی دنیا میں موجود ہوتا ہے یا ہونے والا ہوتا ہے، بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خواب میں دکھایا گیا وہی سب کچھ سلوک سود خوروں کے ساتھ ہوگا۔ سود خور انسانوں کا خون چوستا ہے تو اس کو خون کے دریا میں گرنے کی سزا دی گئی، وہ اپنی شقاوت اور سنگدلی سے حاجت مند انسانوں پر ترس نہیں کھاتا تو اس کے اوپر بھی کسی کو ترس نہیں آئے گا اور مسلسل اس کو سنگ باری کی سزا دوسری سزاؤں کے ساتھ ملتی رہے گی۔

اللہ اکبر! یہ کتنی عبرتناک سزا ہے کہ جس کا تصور ہی انسان کو مضطرب اور بے قرار کرنے کے لیے کافی ہے۔

سانپ کے گھر

عن ابی هريرة قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :اتيت ليلة أسرى بى على قوم بطونهم كا لبيوت فيها الحيات، ترى من خارج بطونهم، فقلت من هؤلاء يا جبريل ؟قال:هؤلاء اكلة الربا۔[ابن ماجہ، ص۷۵۲باب التغلیظ فی الربا،دارالفکر بیروت]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکار سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جس رات مجھ کو سیر کرائی گئی، میں ایسی قوم کے پاس پہنچا کہ ان کے پیٹ گھروں کی طرح تھے اور اس میں سانپ بھرے ہوئے تھے، پیٹ کے باہر سے وہ صاف دیکھے جا رہے تھے، میں نے کہا جبریل یہ کون لوگ ہیں؟ تو جبرئیل نے جواب میں کہا یہ سب سود خور ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے معراج منامی میں نہیں بلکہ معراج جسمانی میں سود خوروں کے حالات کا مشاہدہ فرمایا، وہ صرف عبرت انگیز ہی نہیں تھے، بلکہ رونگٹے کھڑا کر دینے والے

تھے، سود کی دولت جمع کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سانپ پالے، سود کی دولت تجوریوں بینکوں میں جمع کی جاتی ہے، خدا کے ہاں اس کا عذاب یہ ہوگا کہ ایسے سود خور کی تونذ گویا ایک محل ہوگی، وہ بھی صاف شفاف آئینے کی طرح، اس میں یہ دولت کے سانپ جمع کر دیے جائیں گے، دیکھنے والا یہ دیکھے گا کہ یہ سب سانپ اس کے پیٹ میں بھرے پڑے ہیں، خدا کی پناہ، کتنی ہی وحشت ناک سزا ہوگی؟۔

سود کا گناہ زنا سے کئی گنا زیادہ بدتر:

سود کتنا بڑا گناہ ہے، اس کو دار قطنی کی اس روایت سے سمجھا جا سکتا ہے:

عن عبداللّٰہ بن حنظلة غسیل الملائکة قال :قال رسول اللّٰہ ﷺ: درهم ربا یأکله الرجل و هو یعلم اشد من ستة و ثلٰثین زنیَةً۔[مشکوٰة ،ج :۱ ص: ۲۵۱ مکتبه رحمانیه]

عبداللہ بن حنظلہ جن (حنظلہ) کو ان کی شہادت پر فرشتوں نے غسل دیا تھا حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، سود کا ایک درہم جس کو آدمی جان بوجھ کر اپنے مصرف میں لائے چھتیس مرتبہ زنا کاری سے بدتر ہے۔

زنا اور بدکاری سے سماج و معاشرہ میں جو برائیاں پھیلتی ہیں، ان کے انسداد کے لیے کوڑے مارنے یا سنگ ساری کی سزا دنیا میں ملتی ہے، اور اگر بغیر توبہ کے مر گیا تو آخرت میں اس کو کتنی بڑی سزا ملے گی اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، زنا کاری کے جرم سے سود خوری کے جرم کا موازنہ فرماتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ چھتیس بار کی زنا کاری سے یہ بدتر ہے بلفظ دیگر آخرت میں زنا کاری کی سزا سے چھتیس گنا زائد سزا سود خور کو ملے گی۔ الامان الحفیظ

سود خوری کا گناہ ماں کے ساتھ زنا کرنے سے بدتر ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول اللّٰہ ؤ الربٰو سبعون جُزُءًا ایسرها ان ینکح الرجل امهٗ۔[مشکوٰۃ المصابیح، باب الربو، ج۱، ص ۲۵۱ مکتبہ رحمانیہ، ابن ماجہ، ص ۵۲۷ باب التغلیظ فی الربا، دار الفکر بیروت]

ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اگر اس کو ستر اجزا میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ایک ہلکے سے ہلکا جز اس گناہ کے برابر ہوگا کہ آدمی اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔

معاذ اللہ ! اپنی ماں سے بدکاری کتنا بڑا گناہ ہے یوں تو زنا خود ہی بہت بڑا گناہ ہے، اور وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ !اس کا صرف خیال ہی رونگٹے کھڑا کر دینے والا ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے سے ستر گنا بدتر سود خوری کا گناہ ہے، اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ سود خوری کی لعنت سے اسلامی سماج و معاشرے کو پاک وصاف رکھنے میں جو جد و جہد کی جائے گی اس کا اجر کتنا بڑا ہو گا۔

سرکار کی پیشین گوئی:

عن ابی هريرة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم لياتين علىٰ الناس زمان لا يبقىٰ احد الا آكل الربٰو فان لم ياكله اصابه من بخارهٖ و يروى من غباره۔۔[سنن ابی داؤد کتاب البیوع والاجارة باب فی اجتناب الشبهات ص:٦٣٤]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یقیناً لوگوں پر ای ک ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی شخص سود خوری سے نہ بچ پائے گا اور اگر سود خوری سے بچ بھی گیا تو سود کا دھواں یا اس کا غبار ضرور اس کو پہنچ کر رہے گا۔

اس حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے زمانے کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی، جس میں سودی کاروبار اور اس کے لین دین سے بچنا بڑا مشکل امر ہو جائے گا، اگر کسی طرح سے بچ بھی گیا تو کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ ضرور اس میں ملوث ہو جائے گا۔

یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سرکار کی پیشین گوئی کے بموجب وہ زمانہ آ ہی گیا ہے لیکن دیدۂ عبرت سے تمام صنعتی مرکزوں، تجارتی منڈیوں، زراعتی فارموں، بیمہ کمپنیوں کو غور سے دیکھو تو اس کا احساس ضرور اجاگر ہو گا کہ نگاہ نبوت اس زمانے کو دیکھ رہی تھی اور سودی کاروبار کی ہمہ گیری کا مشاہدہ کر رہی تھی جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو تمام طرف سود کا لین دین پھیلا ہوا نظر آتا ہے خواہ وہ بینکوں کے ذریعہ ہو یا بیمہ کمپنیوں کے، ہر جگہ سود ہے اور اس کی غلاظتیں نیز اس کے بخارات اور دھوئیں اڑ رہے ہیں جس سے دامن بچانا مشکل نظر آ رہا ہے۔

سودی کاروبار کی معاونت بھی حرام ہے:

عن علی رضی اللہ عنہ انہٗ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن اٰکل الربٰو و موکلہ و کاتبہ و فی روایۃٍ اُخریٰ و علیٰ شاھدیہ۔ [مشکوۃ المصابیح، باب الربو، ج ۱ ، ۲۵۱، مکتبہ رحمانیہ]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سود کھانے کھلانے والے، اور اس کے لکھنے والے پر لعنت فرمارہے تھے اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس کے گواہوں پر لعنت فرمارہے تھے۔ (مشکوٰۃ ج:۱، ص: ۱۴۷)

سود خوری اتنی بڑی لعنت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کسی طرح معاونت کرنے والے پر لعنت فرماتے ہیں یہاں تک کہ جو شخص سود کا دستاویز لکھے اور جو اس پر گواہیاں دے آپ نے اس پر بھی لعنت فرمائی، لعنت رحمت خداوندی سے دوری کی بد دعا ہوتی ہے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سود کے قریب پھٹکنا بہت بڑا گناہ ہے۔

سود ہلاکت خیز ہے:

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجتنبو السبع الموبقات قیل یا رسول اللہ ماھی قال الشرک باللہ والسحرو قتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق و اکل الربو و اکل مال الیتیم والتولّی یوم الزحف و قذف المحصنات المؤمنات الغافلات۔[صحیح البخاری ،کتاب الوصایا ،ج ۱، ص:۳۸۸قدیمی کتب خانہ کراچی]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات ہلاکت خیز چیزوں سے بچو کہا گیا یارسول اللہ وہ کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کی ذات کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق کسی جان کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، محاذ آرائی کے دن دشمن کے مقابلہ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا، مومن، پاکدامن، بھولی بھالی عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا۔

گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک معمولی دوسرے غیر معمولی بلفظ دیگر ایک صغیرہ، دوسرا کبیرہ، گناہ کبائر کی فہرست میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں دوسری چیزوں کو شمار کرایا

وہیں سود خوری کو بھی شمار کرایا نیز یہ بتایا کہ یہ سب چیزیں ہلاکت برپا کرنے والی ہیں، خواہ دنیا میں ان سے تباہی و بربادی آئے یا آخرت میں، مسلمانوں کو ان سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے، ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب ہلاکت وادبار کو دعوت دینا ہے۔ ان ارشادات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح ہوا کہ سودی کاروبار یا سود خوری بدترین گناہوں میں سے ہے، ہر ایک مسلمان پر لازم ہے کہ اس نجاست کی آلودگی سے اپنے دامن کو داغدار نہ کرے آپ نے مختلف انداز بلکہ حکیمانہ اسلوب بیان سے اس کی حرمت کا صحیح احساس مسلمانوں کو دلایا، اس لیے لازم ہے کہ تتبع کیا جائے کہ سود کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کون سے عناصر ترکیبی ہیں؟ جن سے سود کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے، آئیے ایک نظر سود کی حقیقت پر ڈالتے ہیں۔

۞

باب سوم

سود کا مفہوم:

ربٰو کا لغوی مفہوم اور اس کی شرعی تعریف سود کے لیے جو لفظ قرآن کریم اور احادیث پاک میں استعمال کیا گیا ہے وہ" ربو " ہے جس کے معنی "زیادت "اور "بڑھوتری" کے ہیں عرب میں بولا جاتا تھا ربا فلان رابية۔ وہ ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اسی سے "ربوۃ" قرآن شریف میں آیا ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ عرب کا قول ہے اربى فلان على فلان فى القوم اوالفعل اذا زاد على جب کہ کوئی شخص کسی قول یا فعل میں اپنی طرف سے اضافہ کرے ،اس لفظ سے جتنے مشتقات آتے ہیں سب میں زیادہ تر نمو و زیادت کا معنی پایا جاتا ہے، **فاذا انزلنا علیها الماء اهتزت و ربت**۔[سورہ حم السجدۃ،۳۹،پ۲۴] جب ہم نے اس پر پانی برسایا تو وہ لہلہا اٹھی ،اور بڑھ گئی۔ حدیث پاک میں آیا ہے۔ فلا واللہ ما اخذنا من لقمة الا ربا من تحته اى زاد الطعام الذى دعا فيه النبى صلى الله عليه وسلم بالبركة۔ تو خدا کی قسم ہم نے کوئی لقمہ نہیں اٹھایا، مگر حضور کی دعائے برکت سے اس کے نیچے زیادہ ہو گیا،اربى الرجل بھی بولا جاتا ہے۔ جب کہ آدمی سودی کاروبار کرے۔ یہ ہوئی اس لفظ کی لغوی تحقیق۔

اصطلاح شرع میں اس کا یہ معنی ہے کہ "وہ زیادت جو لین دین یا مبادلے میں ہو، اس کی شرط لگائی گئی ہو اور وہ عوض سے خالی ہو چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: هوالفضل المستحق لأحد المتعاقدين فى المعاوضة الخالى عن عوض شرط فيه۔ [هدايه آخرين ج: ۳،ص: ۷۸ مکتبہ رحمانیہ لاہور]

ہر زیادتی کو ربٰو نہیں کہہ سکتے ،بلکہ اس زیادتی کو ربو نہیں کہا جائے گا، جو عوض سے خالی ہو گا۔ اور معاہدہ میں اس کی شرط لگائی گئی ہو، لہٰذا عوض سے خالی ہونا، اور شرط لگانا، یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے سود کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے البتہ قاضی بیضاوی مذہب شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے حسب عادت اپنی انفرادی شان کے ساتھ ربٰو کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

هو زيادة فی الاجل بان يباع مطعوم بمطعوم او نقد بنقد الی اجل اوفی العوض بان يباع احدهما باكثر منه من جنسه. [بیضاوی ،بقرۃ ، ص ۱۶۲،داراحیاء التراث العربی بیروت]

ربٰو مدت میں زیادتی ہے، بایں طور کہ ایک کھانے کی چیز کو دوسری کھانے کی چیز کے بدلے میں یا ایک ثمن (سونا، چاندی روپیے، پیسے) کو دوسرے ثمن کے بدلے میں ایک مدت تک کے لیے بیچا جائے یا عوض میں زیادتی ہے ،بایں طور کہ دونوں میں سے ایک کو اسی کی جنس سے زیادتی کے ساتھ بیچا جائے۔

محشی شیخ زادہ اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

هو زيادة فی الاجل اوفی العوض فان الاموال الربوية اذا قوبلت بجنسها يحرم كون احد العوضين ازيدَ مِنَ الآخَرِ و يَحرُمُ ايضاً اَن يّكون احدهما نقداً و الآخَرُ مؤجلاً۔ [حاشيه شيخ زاده ج ٢ ص٦٦٨ دارالكتب العلمية بيروت]

وہ مدت یا عوض میں زیادتی ہے،اس لیے کہ سودی مال کا جب اسی کی جنس سے مبادلہ کیا جائے تو ان میں سے ایک کا دوسرے پر زیادہ ہونا حرام ہے،اور یہ بھی حرام ہے کہ ان میں سے ایک کی نقد ادائگی ہو،اور دوسرے کے لیے میعاد مقرر ہو۔

قاضی بیضاوی کی تعریف میں جامعیت نہیں تھی لیکن شیخ زادہ نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اس کو جامع بنادیا اس لیے کہ یہ ربٰو کی تعریف سود کی تمام قسموں پر حاوی ہے۔

امام جصاص جو فقہ حنفی کے مستند ترجمان ہیں وہ ارشاد فرماتے ہیں: اسم الربو فی الشرع يعتوره معان۔[احكام القرآن للجصاص ج ١ ص:٤٦٥]

ربٰو کے اقسام:

ا۔وہ سود جو عہد جاہلیت میں متعارف تھا،امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے الفاظ میں یہ ہے:

واما ربو النسيئة هو الامر الذی كان مشهوراً متعارفاً فی الجاهلية و ذلک انهم كانوا يدفعون المال كل شهرٍ قدراً معيناً و يكون راس المال باقياً ثم اذا حل الدَينُ طالبوا المديون براس المال فان تعذر عليه الاداءُ

زادوا فی الحق والاجلِ ھذا ھو الربوا الذی کانوا فی الجاھلیة یتعاملون۔(تفسیر کبیر، ج ۷ ص ۹۲،دارالفکر بیروت)

رہ گیا ربو نسیئہ تو وہ ایسا معاملہ ہے، جو عہد جاہلیت میں مشہور و متعارف تھا، وہ یہ کہ لوگ اپنا مال دوسرے کو اس شرط پر دیتے تھے کہ ماہ بماہ ایک متعیّن مقدار زائد لیں گے اور اصل مال باقی رہے گا، پھر جب قرض کی ادائگی کا وقت آتا تھا تو مقروض سے اصل مال کا مطالبہ کرتے تھے اگر اس پر قرض کی ادائگی دشوار ہوجاتی تو میعاد اور حق میں اضافہ کردیتے، یہی وہ ربا ہے جس کا لین دین عہد جاہلیت میں جاری تھا۔

اور اسی ربٰو کی تعریف میں امام جصاص اپنی شہرۂ آفاق کتاب احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

ھوالقرض المشروط فیه الاجل و زیادة مال علیٰ المستقرض۔ ربٰو وہ قرض ہے جس میں میعاد اور زیادتی مال کی قرض دار کے اوپر شرط لگائی جائے۔[احکام القرآن، ج ۲، ص ۱۸۹، داراحیاء التراث العربی، بیروت]

سود کی اس قسم کا نام مفسرین کے نزدیک ربٰو نسیئہ ہے، اس لیے کہ ادھار لے کر راس المال سے زیادہ قرض دینے والے کو ادا کیا جاتا ہے اس کو ربٰو القرض بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ قرض ہی کی صورت میں یہ پایا جاتا ہے، اس کا نام ربٰو القرآن بھی ہے، (اس لیے کہ اس کی حرمت قرآن حکیم سے ثابت ہے)، نزول قرآن کے وقت عام طور پر لوگوں میں یہی متعارف تھا، اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو ایک میعادی قرض اس شرط پر دے کہ وہ اصل سرمایہ سے زائد لے گا، سو روپئے قرض دے اور بیس روپئے زائد لینے کی شرط لگا دے، ظاہر ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی چیز قرض دار کو نہیں ملتی، یعنی یہ معاوضہ سے خالی ہے، یہ بیس روپیہ سود ہوئے اور اس کی نجاست سے سو روپئے کا قرض بھی آلودہ ہوگیا، حالاں کہ وہ مال طیب تھا، یہ سود قطعًا حرام ہے، اس کا منکر یا اس کا حلال سمجھنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

۲۔امام جصاص احکام القران میں فرماتے ہیں کہ سود کی دو قسمیں ہیں: ایک سود وہ ہے جو قرض میں ہوتا ہے، اور دوسرا وہ ہے جو خرید و فروخت یا تجارت میں ہوتا ہے، سود کی پہلی قسم کا

بیان تو ہو گیا، رہ گئی دوسری قسم، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

الف: ایک ہی جنس کی چیزوں کو خواہ وہ ناپ سے بکنے والی ہوں، یا وزن سے بکنے والی ہوں، یا ناپ اور وزن دونوں سے نہ بکتی ہوں، بلکہ شمار سے بکتی ہوں، یا کسی دوسرے طریقے سے بکتی ہوں، ان میں مبادلہ یا خرید و فروخت ادھار ہو تو یہ ناجائز ہے، فقہاے کرام اس کو ربو نسیئہ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، حالاں کہ یہ "بیع الی اجل" یعنی ادھار بیع کی ناجائز شکل ہے۔ مثلا کوئی شخص ایک بنارسی ساڑی دے کر دوسری بنارسی ساڑی ادھار کر لے۔

ب: ایسی چیزیں جو کیلی اور وزنی ہوں باہم خلاف جنس سے بیچی جائیں، مثلاً گیہوں کو جو کے بدلے میں ادھار بیچا جائے، یا لوہا کو تانبہ کے بدلے میں ادھار بیچا جائے، یہ بھی ناجائز و حرام ہے، اور اس کو بھی فقہاے کرام ربو نسیئہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، حالاں کہ یہ بھی ناجائز بیع کی ایک صورت ہے۔

ج: ایسی زیادتی جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے لین دین میں ہو، ساتھ ہی دونوں کیلی یا وزنی ہوں، اس کو ربوالفضل کہا جاتا ہے، اس کی حرمت کا ثبوت حدیث متواتر سے ہے، بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ربو کے مفہوم میں وسعت پیدا کر دی تو اس کی بھی حرمت کا ثبوت ایک طرح سے قرآن عزیز سے ہی ہوا، لہذا یہ بھی قطعاً حرام ہے، ربوالفضل کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے گیہوں دے کر گیہوں خریدا اور یہ مبادلہ دست بدست ہوا، لیکن کیل میں زیادہ لے لیا یہ زیادتی "ربوالفضل" کہلائے گی، فقہاے حنفیہ کے نزدیک اگر کوئی چیز کیلی یا وزنی ہو اور دست بدست اسی کی ہم جنس سے اس کا مبادلہ ہو رہا ہو تو تفاضل قطعاً حرام ہے، اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کریمہ میں اس کو ناجائز بتایا ہے، سود کی اس قسم کے بارے میں چند حدیثیں آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں:

۱۔عن ابی سعید الخدری قال :قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل یدا بید فمن زاد او استزاد فقد اربی والآخذ والمعطی فیه سواء ۔[مسلم شریف ، باب الربو، ج ۲، ص ۲۵، قدیمی کتب خانه کراچی]

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ سرکار نے فرمایا: سونے کی خرید و فرخت سونے سے، چاندی کی چاندی سے، گیہوں کی گیہوں سے، جو کی جو سے، کھجور کی کھجور سے، نمک کی نمک سے، برابر برابر دست بدست ہونی چاہئے، جس نے زیادہ دیا یا لیا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔

۲۔عن عبادة بن الصامت رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد۔(رواه مسلم) (حوالۂ سابق)

عبادہ بن صامت نے سرکار سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا سونے کا مبادلہ سونے سے چاندی کا چاندی سے، گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے، نمک کا نمک سے، اس طرح ہونا چاہئے کہ ایک دوسرے کے مثل برابر دست بدست ہوں، ہاں اگر مختلف قسم کی چیزوں کا مبادلہ ہو تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطے کہ لین دین دست بدست ہو۔

۳۔ عن ابى سعيد الخدرى قال: قال رسول الله: لاتبيعوالذهب بالذهبالا مثلاً بمثل ولا تشفوابعضها علىٰ بعض ولا تبعوا منها غائباً بناجزٍ(حوالۂ سابق،ص ۲۴)

حضرت ابو سعید خدری نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو، مگر برابر برابر، کوئی کسی کو زیادہ نہ دے اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو، مگر یہ کہ ایک دوسرے کے مثل ہو اور کوئی کسی کو زیادہ نہ دے اور ان میں سے غائب کو حاضر کے بدلے نہ بیچو۔

۴۔عن ابى هريرة عن النبى صلى الله عليه وسلم قال :التمر بالتمر، الحنطة بالحنطة ،والشعير بالشعير، والملح بالملح مثلاً بمثل يداًبيداٍفمن زاداو استزاد فقد اربى الا ما اختلفت الوانه۔ [صحيح مسلم، كتاب المساقات، رقم الحديث ١٥٨٨،سنن نسائى، كتاب البيوع، رقم ۴۵۵۹]

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کھجور کی

فروخت کھجور سے کرو، گیہوں کی گیہوں سے، جو کی جو سے، نمک کی نمک سے، برابر برابر دست بدست ہونی چاہیئے، جس نے زیادہ دیا یا لیا سودی کام کیا، سوائے اس صورت کے کہ اس کے رنگ بدل جائیں۔

ان احادیث سے حسب ذیل احکام ثابت ہوتے ہیں:

الف: ایک ہی جنس کی چیزوں کی خرید وفروخت جب کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہو بغیر کمی بیشی کے دست بدست جائز ہے، اگر ادھار ہو جائے تو گو کہ دونوں برابر ہوں ناجائز ہے، مثلا اگر کوئی شخص گیہوں کے بدلے گیہوں لینا چاہے تو دونوں کو کیل میں برابر ہونا چاہئے اور لین دین دست بدست ہو جبھی جائز ہے، اور ایسے مبادلہ کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کہ ایک ہی جنس کی چیزوں میں کچھ فرق ہو، مثلاً کسی کا چاول اور گیہوں عمدہ قسم کا ہو اور دوسرے کا چاول یا گیہوں گھٹیا قسم کا ہو تو ایسی صورت میں ضرورت اور حاجت کے مطابق کچھ زائد لین دین کا امکان تھا، اس پر پابندی لگا دی گئی کہ ایک ہی جنس کی چیزوں میں تفاوت ہونے کے باوجود کمی بیشی قطعاً ناجائز ہے اور اس زیادتی کو رٰبوالفضل کا نام دیا گیا۔

ب: اگر جنس مختلف ہو جائے، مثلاً گیہوں کا مبادلہ جو سے ہو تو جس طرح چاہیں خرید وفروخت کر سکتے ہیں، خواہ کمی بیشی کے ساتھ ہو یا برابر، مگر اس میں یہ شرط لازمی ہے کہ دست بدست ہونا چاہئے، اگر دست بدست نہ ہوا تو یہ بھی ناجائز وحرام ہے، فقہاے کرام کی اصطلاح میں اس کو رٰبو نسیئہ کہتے ہیں۔

ج: اگر ایک ہی جنس کی چیزوں میں مبادلہ برابر برابر ہو لیکن ایک چیز ادھار ہو دوسری نقد ہو، مثلاً گیہوں کا مبادلہ گیہوں سے ہو تو برابر برابر ہونے کے باوجود رٰبو کے دائرے میں آکر ناجائز ہو گا، اور اس کو بھی فقہا کی اصطلاح میں رٰبو نسیئہ کہتے ہیں۔

د: یوں ہی یہ ادھار تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ہو تو بھی ناجائز ہے۔

مذکورہ بالا احکام ان اشیا کے مبادلہ کے بارے میں ہیں جو کیلی یا وزنی ہوں، پھر ایک ہی جنس کی ہوں یا مختلف جنس کی لیکن اگر کیلی یا وزنی نہ ہوں اور مختلف جنس کی ہوں تو ان کی خرید وفروخت یا لین دین ہر طرح سے جائز ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

یہاں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اشیا کے مبادلے کا دائرہ اس قدر تنگ کر دیا گیا ہے کہ ایک ہی جنس کی چیزوں کے ہونے کی صورت میں برابر برابر ہونے کے باوجود ادھار خرید و فروخت ناجائز ہے تو انسان کی بعض ضرورتیں کیسے پوری ہوں گی؟ مثلا ایک شخص کے پاس خراب گیہوں ہے تو دوسرے کے عمدہ گیہوں سے زائد دے کر مبادلہ نہیں کر سکتا، کیوں کہ اگر زائد دیتا ہے تو یہ ربوالفضل ہو جائے گا جو ناجائز و حرام ہے، اب دوسرا کہتا ہے کہ میں سود کے گناہ کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا، میں تم سے اپنے اچھے گیہوں کو ادھار بیچ رہا ہوں، جب فصل تیار ہو جائے تو مجھے عمدہ گیہوں لا کر دے دینا اور برابر ہی دینا، میں زیادہ نہیں لوں گا، اس لیے کہ زیادہ لینے کی صورت میں سود ہو جائے گا لیکن اس کو کیا خبر یہ برابر ہی خرید و فروخت ناجائز حرام ہے، اب بتائیے ضرورت کیسے پوری ہو گی؟

یہ محض وسوسہ ہے ایسی صورت میں جب کہ انسانی حاجت کے پورا ہونے کا سوال ہو تو اسلامی شریعت ہدایت کرتی ہے کہ اپنے حاجت مند بھائی کی مدد کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ اور اس کے ساتھ انسانی مروت کا یہ ثبوت دو کہ بجائے خرید و فروخت کے اس کو قرض دے دو، مثلا جب ایک من گیہوں دے کر ایک من بطور خرید و فروخت لینا چاہتے ہو اور تمھاری خواہش زیادہ لینے کی نہیں ہے تو پھر قرض کیوں نہیں دے دیتے، قرض کے سلسلے میں شریعت اسلامی بالکل آزادی دیتی ہے کہ روپے قرض دے کر اتنے ہی روپے لے لو، اسی طرح گیہوں قرض دے کر اسی کے برابر گیہوں لے لو، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں پائی جا رہی ہے، لیکن جب معاملہ خرید و فروخت کا ہو یا تجارت کا ہو تو ایسی تجارت شرعا اس لیے ممنوع ہے کہ اس سے سودی کاروبار کی ذہنیت کو بڑھاوا ملے گا، اعلی حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالی عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

قرض تو ایک دوسرا عقد ہے بیع کے سوا جسے شریعت مطہرہ نے حاجات ناس کے لیے جائز فرمایا، بڑا قرض تو روپے کا ہوتا ہے مگر روپیہ قرض لینا جائز ہے، خود غلہ قرض لینا صحیح حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

ایک ہی جنس کے تفاوت کا حکم

ایک ہی جنس کی چیزوں میں اگر چہ بین تفاوت ہو جائے اور اس کی وجہ سے قیمتوں میں بڑا فرق پیدا ہو جائے تاہم کمی بیشی ناجائز ہے، یعنی فضل حرام ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک سے اس کا ثبوت ہے، اس لیے قیاس آرائی محض ناجائز ہے۔

۱۔ عن أبي سعيد الخدري وعن أبي هريرة رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استعمل رجلا على خيبر ،فجاءه بتمر جنيب ،فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :أكل تمر خيبر هكذا؟ قال :لا والله يا رسول الله إنا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين والصاعين بالثلاث ،فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تفعل ،بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبا۔ [صحيح مسلم، باب الربو، ج ۲، ص ۲٦، قديمی كتب خانه كراچی]

ابو سعید و ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنایا تو وہ سرکار کے پاس مال گزاری میں عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر آئے، آپ نے دریافت فرمایا: کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے کہا: نہیں، خدا کی قسم! ہم کو جو کھجوریں ملتی ہیں (مخلوط) انہیں کبھی دو صاع کے بدلے میں ایک صاع اور تین صاع کے بدلے دو صاع اچھی کھجوروں سے بدل لیا کرتے ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ پہلے مخلوط کھجوروں کو درہموں کے عوض میں فروخت کر دو پھر اچھی قسم کی کھجوریں درہموں کے عوض میں خرید لو۔

۲۔عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال : جاء بلال إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم بتمر برني فقال له النبي صلى الله عليه وسلم : من أين لك هذا ؟ قال بلال : كان عندنا تمر رديء، فبعت منه صاعين بصاع، فقال النبي صلى الله عليه وسلم : أوه ، أوه ، عين الربا ، عين الربا، لا تفعل. ولكن إذا أردت أن تشتري فبع التمر ببيع آخر، ثم اشتر به ۔ [صحيح البخاری،باب اذا باع الوكيل شيئا فاسدافبيعه مردود، ج ۱، ص ۳۱۱، قديمی كتب خانه كراچی]

ابو سعید کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بلال حضور کے پاس برنی (اچھی قسم کی کھجوریں) لے کر آئے ،آپ نے فرمایا: کہاں سے لائے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہمارے پاس گھٹیا قسم کی کھجوریں تھیں، میں نے اسی میں سے دو صاع دے کر یہ اچھی کھجور ایک صاع خرید لی، آپ نے فرمایا: ہائیں! یہی تو سود ہے! ایسا مت کرو، جب تمہیں اچھی کھجوریں خریدنی ہوں تو اپنی کھجوریں درہم یا کسی دوسری چیز کے عوض بیچ دو پھر اس قیمت سے اچھی کھجوریں خرید لو۔

۳۔عن أبي سعيد رضي الله عنه قال :كنا نرزق تمر الجمع وهو الخلط من التمر وكنا نبيع صاعين بصاع ،فقال النبي صلى الله عليه وسلم :لا صاعين بصاع ولا درهمين بدرهم۔[صحیح البخاری، باب بیع الخلط من التمر، ج ۱، ص ۲۷۹، قدیمی کتب خانہ کراچی]

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو تنخواہوں میں ملی جلی کھجوریں ملا کرتی تھیں اور ہم دو صاع مخلوط قسم کی کھجور دے کر ایک صاع اچھی قسم کی کھجور لے لیا کرتے تھے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو صاع کو ایک صاع کے بدلے اور دو درہم کو ایک درہم کے بدلے نہ بیچو۔

ان تمام حدیثوں کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک ہی جنس کی چیزوں میں تفاوت کی وجہ سے زیادہ لینا جائز نہیں ہے، اگر کوئی چیز عمدہ قسم کی ہو اور وہی چیز دوسرے کے پاس گھٹیا درجے کی ہو، مثلاً گیہوں، چاول، جو وغیرہ کا مبادلہ انہیں کی جنس سے کمی بیشی کے ساتھ ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے، خواہ ان اجناس میں باہم کتنا ہی فرق ہو، اس لیے اگر ایسی ضرورت پڑ جائے کہ عمدہ چیز کو خراب کے بدلے لینا ہو، مثلاً خراب چاول کے بدلے اچھا چاول لینا ہو تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اپنے خراب چاول کو فروخت کر کے اس کی قیمت کے بدلے میں عمدہ چاول خریدے، ایسا نہیں کر سکتا کہ اپنا خراب چاول زائد دے کر اس کے بدلے میں عمدہ قسم کا چاول کم خریدے کیوں کہ اس کو سرکار دو عالم علیہ السلام نے سود بتایا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اشیا کے مبادلے میں جب کہ ایک ہی جنس کی ہوں قیمتوں کی کمی بیشی کا کوئی لحاظ نہ ہو گا، بلکہ ایک ہی جنس کی چیزیں اگر ایسی ہوں کہ سوکھنے کے بعد کم ہو جاتی ہوں تو ان کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے، خواہ برابر برابر بیچی جائیں یا کمی بیشی کے ساتھ۔

قال سعد: سمعت رسول الله ﷺ يسئل عن اشتراء التمر بالرُّطبِ فقال لمن حوله أيَنقُصُ الرطب اِذا يبس قالوا نعم فنهىٰ عن ذالک۔

[ترمذی ج ۱ص ۱۴۷،باب البیوع]

سعد بن وقاص کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور میں سن رہا تھا کہ خشک کھجور کا مبادلہ کس تر کھجور کے ساتھ کیا جائے؟ آپ نے دریافت فرمایا: کیا تر کھجور کم ہو جاتی ہے جب کہ خشک ہو جائے؟ تو سائل نے عرض کیا: ہاں! تو آپ نے اس مبادلہ سے منع فرمایا، یعنی آپ نے فرمایا کہ کسی طرح اس کی تجارت نہیں ہو سکتی، نہ برابر، نہ کمی بیشی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

سوال وجواب:

کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنس کی اچھی اور خراب چیزوں کی خرید و فروخت کو زیادتی کے ساتھ ممنوع قرار دے کر پھر اچھی چیز کی خرید کی یہ تدبیر بتائی کہ خراب چیز کو بیچ کر اس کے بدلے میں قیمت کے ذریعے عمدہ چیز حاصل کی جائے، یہ تدبیر ربوالفضل سے بچنے کے لیے بہتر ہونے کے باوجود اس میں بعض اوقات پریشانی اٹھانی پڑے گی، ایسا کیوں نہیں کیا جاتا کہ کوئی چیز عمدہ ہو جب اس کو اسی کی جنس کی گھٹیا چیز سے مبادلے کیا جائے تو عمدہ چیز کی قیمت لگا کر اور وہ بھی بازار بھاؤ سے خراب چیز زیادہ لے لی جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ اشیا کی خرید و فروخت میں جو رِبٰو ہوتا ہے اس کو اس لیے حرام کیا گیا ہے کہ اس سے رِبٰو حقیقی کا دروازہ بالکلیہ بند کرنا مقصود تھا اور قیمت والی تدبیر سے وہ ذہنیت مردہ نہ ہوتی جو رِبٰو حقیقی کا سبب بنتی ہے، ربو حقیقی در اصل رِبٰوالقرض ہے اور اس کو رِبٰوئے نسیئہ بھی کہا جاتا ہے، چناں چہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں رقمطراز ہیں کہ:

”اعلم ان الربو علی وجهین: حقیقی و محمول علیه ،اما الحقیقی فهو فی الدیون و قد ذکرنا ان فیه قلبالموضوع المعاملات و ان الناس کانوا

منهمكين فيه في الجاهلية اشد انهماک و کان حدث لاجلهٖ محاربات مستطيرة و کان قليله يدعوالى کثيرهٖ فوجب ان يسد بابه بالکلية و لذلک نزل في القرآن في شانه مانزل والثانی ربٰو الفضل والاصل فيه الحديث المستفيض :الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد ،فاذااختلفت هذه الاصناف فبيعوا کيف شئتم اذا کان يدا بيدٍ و هو مسمّی بربٰو تغليظا و تشبيها له بالربٰو الحقيقی على حد قوله عليه السلام "المنجم کاهن" و بهٖ يفهم معنی قوله صلى الله عليه وسلم"لاربٰو الا فی النسيئة، ثم کثر في الشرع استعمال الربٰو فی هذا المعنیٰ حتی صارت حقيقة شرعية فيه ايضاً والله اعلم۔ [حجة الله البالغه، ج ۲، من ابواب ابتغاء الرزق مطبع دارالجيل]

تم جان لو کہ رِبٰو کی دو قسمیں ہیں:(۱)حقیقی (۲)جو رِبٰوئے حقیقی پر محمول ہو، رِبٰوئے حقیقی دیون میں ہوتا ہے اور ہم نے پہلے بتا دیا ہے کہ اس میں معاملات کا مقصد بالکل الٹ پلٹ جاتا ہے اور عہد جاہلیت میں لوگ اس میں بہت منہمک رہتے تھے اور اسی کے سبب بڑی لمبی لڑائیاں وجود میں آئیں ،اس قسم کا معمولی ربا غیر معمولی رِبٰو کا سبب بنتا ہے،اس لیے لازم ہے کہ اس کا دروازہ مکمل طور سے بند کر دیا جائے،چناں چہ قرآن شریف میں بہت کچھ وعیدیں اس کے بارے میں نازل ہوئیں، رِبٰو کی دوسری قسم ربوالفضل ہے ،اس کی حرمت کا ثبوت یہ حدیث مشہور ہے کہ سونے کا بیچنا سونے کے بدلے میں ،چاندی کا چاندی کے بدلے کے میں، گیہوں کا گیہوں کے بدلے میں، جو کا جو کے بدلے میں ، چھوہارے کا چھوہارے کے بدلے میں، نمک کا نمک کے بدلے میں ،برابر دست بدست جائز ہے اور جب یہ اجناس بدل جائیں تو جیسا چاہو بیچو، جب کہ دست بدست ہو، رِبٰوالفضل کو رِبٰو حقیقی سے تشبیہ کی بنا پر رِبٰو نام رکھا گیا ہے ،جیسے کہ سرکار کے قول "المنجم کاھن" میں ہے ،اسی سے سرکار علیہ السلام کا قول "لاربٰو الافی النسیئۃ" کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے، پھر شریعت میں رِبٰو کا استعمال اس معنٰی میں بھی حقیقت شرعیہ ہو گیا ہے ۔واللہ اعلم ۔[حجۃ اللہ البالغۃ،الجزء الثانی، ص ۱۰۶۔۱۰۷]

اسی ربوٰئے حقیقی کو مشہور حنفی فقیہ و محدث امام طحاوی رضی اللہ عنہ ربوالاصل سے تعبیر کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

وكان الحجة لهم فى تاويل حديث ابن عباس رضى الله تعالىٰ عنهماعن اسامة الذى ذكرنا فى الفصل الاول ان ذلك الربٰو انما عنى به ربٰو القرآن الذى كان اصله فى النسئية ۔

وہ حدیث جس کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس کی تاویل کے سلسلے میں ائمہ کرام کی حجت یہ ہے کہ اس ربٰو سے ربٰو القرآن مراد ہے جس کی اصل قرض میں ہے۔[شرح معانی الاثار المجلد الرابع ص: ۶۵،عالم الکتب بیروت]

پھر اسی ربٰو کو مشہور حنفی محدث شارح بخاری امام علامہ بدرالدین عینی ربوٰئے اکبر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، چناں چہ حدیث "لا ربٰو الافى النسئية" کی شرح کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

واختلفوا فى الجمع بينه و بين حديث ابى سعيد فقيل منسوخ و قيل معنىٰ لا ربٰو اغلظ شديد التحريم المتوعد عليه بالعقاب الشديد كما تقول العرب لا عالم فى البلد الازيد ،مع ان فيه علماء غيره و انما القصد نفى الاكمل لا نفى الاصل و ايضاً فنفى تحريم ربواالفضل من حديث اسامة انما هو بالمفهوم فيقدم عليه حديث ابى سعيد لان دلالته بالمنطوق و يحمل حديث اسامة على الربٰو الاكبر ۔[عمدة القارى شرح البخارى الجزء التاسع ص۳۹۳]

شراح حدیث نے حضرت اسامہ اور حضرت ابو سعید کی حدیثوں کے درمیان جمع و تطبیق کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت اسامہ کی حدیث منسوخ ہے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا شدید تر ربٰو نہیں ہے، جس پر اتنی شدت کے ساتھ سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہو جیسا کہ عرب کہتے ہیں کہ "لا عالم فى البلد الا زيد" حالاں کہ شہر میں اس کے علاوہ بھی عالم ہوتے ہیں، مقصود

کامل ترکی نفی کرنی ہے نہ اصل کی نفی مقصود ہے،علاوہ ازیں حضرت اسامہ کی حدیث سے رٰبو الفضل کی حرمت کی نفی بطریق مفہوم مخالف ثابت ہوتی ہے، تو حضرت ابو سعید کی حدیث کو ترجیح حاصل ہوگی، کیوں کہ اس کی دلالت بالمنطوق ہے اور اسامہ کی حدیث کو رٰبوے اکبر پر حمل کیا جائے گا۔

حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں اسی رٰبوے حقیقی کو رٰبوے جلی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور صراحتً لکھتے ہیں کہ رٰبو الفضل کو در اصل رٰبوئے جلی یعنی رٰبوئے حقیقی کا دروازہ بند کرنے کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے ،وہ اپنے مخصوص انداز میں اس مسئلے پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

الربٰو نوعان، جلی و خفی ،فالجلی حرم لما فیه من ضرر عظیم والخفی حرم لانه ذریعة الیٰ الجلی فتحریم الاول قصداً و تحریم الثانی وسیلةً. فاما الجلی فربا النسئیة و هو الذی کانوا یفعلونه فی الجاهلیة مثل ان یوخردینه و یزید ه فی المال و کل مااخره زاد فی المال حتی تصیر المائة عنده آلا فامولفة۔[اعلام المؤقعین الجزء الثالث ص۳۹۷،دارابن الجوزی ،المملکة العربیة السعودیة]

ربو کی دو قسمیں ہیں: (ا) جلی (۲) خفی ۔ رٰبوے جلی کو بہت بڑے نقصان کی وجہ سے حرام کیا گیا اور رٰبوے خفی کو اس لیے حرام کیا گیا ہے کہ وہ ربوے جلی کا ذریعہ ہے اس لیے پہلے ربوے جلی کی تحریم بالذات وقصداً ہے اور ربوے خفی کی تحریم بالواسطہ ہے، باقی رہا ربوے جلی تو وہ رٰبوے نسیہ ہے یہ وہی رٰبو ہے جس کا لین دین عہد جاہلیت میں لوگ کرتے تھے، جیسے کہ اپنے قرض کو موئخر کردے اور اپنا مطالبہ بڑھادے اور جب جب موئخر کرے تو مال کے اندر اضافہ کردے، یہاں تک کہ ایک سو ہزار ہا ہزار کے وصولنے کا ذریعہ بن جائے۔

پھر رٰبوالفضل کی مزید توضیح کرتے ہوئے حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

و اما ربوالفضل فتحریمه من باب سد الذرائع کما صرح به فی حدیث ابی سعید الخدری رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه

وسلم لاتبیعواالدرھم بدرھمین فانی اخاف علیکم الرباء والرماء ھو الرباء، فمنعھم من رباالفضل لما یخافه علیہم من ربالنسیئة وذلک انھم اذا باعوا درھما بدرھمین ولا یفعل ھذا الاللتفاوت الذی بین النوعین، اما فی الجودة واما فی السکة واما فی الثقل والخفة وغیر ذلک ،تدرجوا بالربح المعجل فیھا الی الربح المؤخر ھو عین ربالنسیئة و ھذه ذریعة قریبة جداً ،فمن حکمة الشارع ان سد علیھم ھذه الذریعة ،فمنعھم من بیع درھم بدرھمین نقداًونسیئة، فھذه حکمة معقولة مطابقة للعقول ۔[اعلام المؤقعین الجزء الثانی ص ۳۹۸۔۳۹۹]

باقی رہا رِبوا الفضل تو اس کو اس لیے حرام قرار دیا گیا کہ سود کا دروازہ بند کر دیا جائے، جیسا کہ اس کی تصریح ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے،وہ یہ ہے کہ ایک درہم کو دو درہم کے بدلے مت بیچو،اس لیے کہ میں تمھارے لیے رِبو سے ڈرتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا الفضل سے اس لیے منع کر دیا کہ اس کی وجہ سے آپ کو ربا نسیئہ کا اندیشہ تھا،وہ اس طور پر کہ جب ایک درہم کو دو درہم کے بدلے بیچا جائے گا اور بالکل یہ ظاہر بات ہے کہ یہ صرف ان دونوں قسم کے درہم میں فرق کی وجہ سے ہو گا، خواہ یہ فرق کھرا ہونے ،یا ڈھلے ہوئے ہونے سے ہو یا یہ فرق وزنی یا ہلکاپن کی وجہ سے ہو، تو آہستہ آہستہ فوری نفع کے ذریعے دیر میں ملنے والے نفع تک پہونچ جائیں گے اور یہی ربا نسیئہ ہے اور رِبوئے نسیئہ کے لیے یہ بہت قریب ذریعہ تھا،اس لیے شارع حکیم نے ان کے اوپر اس ذریعہ کو بند کر دیا اور روک دیا گیا،ایک درہم کو دو درہم کے بدلے دست بدست یا ادھار بیچا جائے، یہ سمجھ میں آنے والی حکمت ہے جو عقلوں کے مطابق ہے.

اہل سنت کے مشہور عالم دین حضرت مولانا غلام رسول صاحب سعیدی ربا الفضل کی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

در اصل ربالفضل کی حرمت ایک انسدادی نوعیت کا حکم ہے،چوں کہ عرب میں عام رواج تھا کہ وہ ہم جنس اشیا کا دست بدست تبادلہ کرتے تھے اور اس میں کمی بیشی کو جائز رکھتے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش بندی کے طور پر ہم جنس اشیا میں تفاضل اور قرض

(ادھار) کو بھی حرام فرما دیا، تاکہ یہ معاملہ کہیں رباالنسیئہ کی طرف متعدّی نہ ہوجائے، جو حرام قطعی ہے، اس کی تاکید اس بات سے ہوتی ہے کہ کنزالعمال کی روایت میں اس حدیث کے ساتھ یہ الفاظ بھی وارد ہیں: فانی اخاف علیکم الرباء ۔مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں اس دست بدست زیادتی سے تم سود کی لعنت میں نہ گرفتار ہوجاؤ اور اس کی مزید تاکید امام بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے جو وہ حضرت اسامہ سے روایت کرتے ہیں:

اخبرنی اسامة ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال لی لاربٰوالا فی النسیئة ۔ [صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب بیع الدینار بالدینار، ج۱، ص۲۹۱، مطبع سابق]

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت اسامہ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سود نہیں ہے مگر ادھار میں۔

اس حدیث کا صحیح محمل یہی ہے کہ جو ربٰو حرام قطعی ہے اور جس پر عذاب کی وعید شدید ہے وہ ربٰوالنسیئہ ہے جس کو ربٰوالقرآن کہتے ہیں اور ربٰوالافضل جس کا حدیث شریف میں ذکر ہے اس کی حرمت ظنی اور انسدادی نوعیت کی ہے۔ [مقالات سعیدی ص۳۵۹۔۳۶۰، ضیاء القرآن پبلیشر پاکستان]

ان تفصیلات سے واضح ہوا کہ ربوائے حقیقی کا دروازہ مکمل طور سے بند نہیں ہوسکتا، جب تک کہ ربٰوالفضل یعنی خرید و فروخت کے معاملات میں جو ربٰو ہوتا ہے اس پر پابندی عائد نہ کی جائے، کیوں کہ اس قسم کے سود سے ربٰوے حقیقی کی ذہنیت کو بڑھاوا مل سکتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ربوائے حقیقی کی طرف جانے کے یہ سب راستے تھے اس لیے شارع حکیم نے ان سب کو سختی کے ساتھ ممنوع قرار دیا کیوں کہ شریعت اسلامی کا عام دستور یہ ہے کہ جب کسی چیز کو حرام کیا جاتا ہے تو اس کی طرف لے جانے والے تمام راستوں کو بھی ایک ایک کر کے بند کر دیا جاتا ہے، لیکن انسانی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کی سبیلیں بھی نکالی جاتی ہیں، اور وہ سبیل اس مسئلہ میں یہی تھی کہ اگر کوئی عمدہ شئ ہو اور اسی کی جنس سے جو کم درجہ کی ہو مبادلہ کیا جائے تو اس گھٹیا چیز کو قیمتوں سے بدل لیا جائے، تھوڑی سی زحمت ضرور اٹھانی پڑے گی لیکن شیطان کے داخل ہونے کا دروازہ بالکل بند ہوجائے گا۔

خلاصہ بحث:

غرض یہاں تک جو کچھ بیان ہوا اس میں ربوالقرض یا ربوالدین اور دوسرے اقسام کی قباحتوں کا جائزہ قدرے تفصیل کے ساتھ لیا گیا۔

ہمارے قارئین پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیئے کہ ربوالفضل کا ثبوت حدیث متواتر سے ہے اور یہ رٰبو نزول قرآن کے وقت عام طور پر جاری نہیں تھا بلکہ رٰبو نسیئہ ہی جاری تھا، اسی لیے حضرت عبداللہ ابن عباس کا مسلک یہ تھا کہ اگر کوئی شخص دست بدست زائد رقم لے لے تو یہ سود نہیں ہے، نہ حرام کے زمرے میں داخل ہے بلکہ سود یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے سے قرض لے اور زائد کی شرط لگا دے یا کسی کے ذمے کوئی دَین ہو وہ اس کے وقت متعیّن پر ادا نہ کر سکے تو دائن مدیون پر اپنے قرض سے زائد وصول کرے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی دلیل حضرت عکرمہ والی حدیث ہے جس کو امام طحاوی نے متعدّد سندوں سے تخریج کی ہے، وہ حدیث یہ ہے: "لا ربوالا فی النسیئۃ" یا "انما الربوافی النسیئۃ" گویا آیت تحریم ربا کے نزول کے وقت جو رٰبو متعارف تھا اسی کو عبداللہ بن عباس نے سود سمجھا تھا، لیکن جب رٰبوالفضل کی حدیثیں وارد ہوئیں اور رٰبو کا دائرہ وسیع ہو گیا تو حضرت عبداللہ بن عباس نے اپنے موقف سے رجوع کیا، اور وہ بھی دوسرے صحابہ کرام کی طرح ربوالفضل اور رٰبوالنسیئہ دونوں کی حرمت کے قائل ہوئے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے پہلے موقف سے رجوع کے وقت آپ نے توبہ واستغفار بھی کیا۔

عہد قدیم اور عہد جدید دونوں میں رٰبو الفضل کا رواج کم رہا ہے، ہاں رٰبوالقرض یا ربوالدین یا ربوالنسیئہ کا دور دورہ ہر زمانے میں رہا، بلکہ عصرِ حاضر میں اس کی حکمرانی ساری دنیا پر مسلط ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ عہد پاک رسالت کے ابتدائی دور میں اس رٰبو کی کتنی صورتیں پائی جاتی تھیں، تلاش وجستجو کے بعد جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ نذر قارئین ہے۔

رِبٰوئے نسیہ کی صورتیں:

۱۔ امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں کہ عہد جاہلیت کا رِبٰو یہ تھا کہ لوگ اپنا مال دوسرے کو اس شرط پر دیتے تھے کہ ماہ بماہ ایک متعیّن مقدار زائد لیں گے اور اصل مال باقی رہے گا، پھر جب قرض کی ادائگی کا وقت آتا تو اس سے راس المال کا مطالبہ کرتے تھے، اگر ادائگی دشوار ہو جاتی تو میعاد اور حق میں اضافہ کر دیتے۔[التفسیر الکبیر المجلد الرابع ص۷۸، ج۴، دارالحدیث قاہرہ]

۲۔ حضرت ابو بکر جصاص کے بقول ایک خاص مدت تک قرض لے کر اصل رقم سے زائد کا معاہدہ کرتے تھے۔[احکام القرآن للجصاص ج۲ ص۱۸۴، داراحیاء التراث العربی بیروت)

۳۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کا دوسرے شخص کے اوپر عہد جاہلیت میں ایک خاص وقت کے لیے قرض ہوتا تھا، پھر جب میعاد پوری ہو جاتی تھی تو مطالبے پر قرض دار یہ کہتا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے مہلت دے دو ہم تم کو زیادہ مال دیں گے، اس طرح برابر سود میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔[جامع البیان ج ۵ ص ۴۳، مرکز البحوث والدراسات العربیہ بدار ھجر]

۴۔ حضرت قتادہ کے بیان کے مطابق جاہلیت کا رِبٰو یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی مال فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا، جب وقت گذر جاتا تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا تھا۔[مرجع سابق ص۳۸]

ان تمام صورتوں پر "جو دراصل رِبٰوالقرض یا رِبٰوالدین کی مختلف شکلیں ہیں" آپ غور فرمائیں تو آپ پر واضح ہو گا کہ عہد قدیم یعنی زمانۂ جاہلیت یا قرون مظلمہ میں سود کی جتنی صورتیں پائی جاتی تھیں شاید ہی کوئی ایسی صورت ہو کہ عہد جدید یا قرن منور میں نہ پائی جاتی ہو، آج بھی ماہ بہ ماہ یا سالانہ قرض کے اوپر سود لیا جاتا ہے، ایک خاص وقت کے لیے رقم لی جاتی ہے، سودی دولت میں برابر اضافہ کی تدبیریں نکالی جاتی ہیں، کس کو نہیں معلوم کہ اشیا کی خرید و فروخت میں سود کا دھندہ آج بھی جاری ہے اور زمانہ جاہلیت میں بھی جاری تھا، اس لیے سود کی حرمت کے سلسلے میں یہ بکواس قابل مذمت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تجارتی سود کا رواج نہیں تھا۔

ائمہ کا اختلاف:

ہم اس بات کو بار بار بیان کر آئے ہیں کہ حقیقی ربٰو ربٰو نسیہ ہے، چوں کہ بہت سے اہل علم اس نکتے سے ناآشنا ہیں اور اس پر اچنبھا ہو جاتے ہیں اس لیے اس خاص نکتے پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی، مگر یہ بات خصوصیت کے ساتھ فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ حضور ﷺ نے خرید وفروخت کے بہت سے معاملات کو سود کے زمرے میں شامل فرمایا، ان کی حرمت میں بھی کلام نہیں کیا جاسکتا، ہاں ائمہ کرام کے درمیان علت ربٰو کے بارے میں اختلاف برپا ہوا اس لیے اس پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

حنفیہ کا مذہب: حنفیہ کے نزدیک ہر کیلی یا وزنی چیز میں جنس کے اتحاد سے ربٰو کا وجود ہوتا ہے، مثلاً گیہوں کو گیہوں کے بدلے بیچا جائے اور زیادتی ہو تو ربٰو ہوگا۔

شافعیہ کا مسلک: شوافع کے نزدیک غذائیت یا ثمنیت اتحاد جنس کے ساتھ حرمت ربٰو کی علت ہے، یعنی غذا والی چیزوں میں جنس کا اتحاد ہو جائے تو ربٰو ہوگی، یوں ہی سونا چاندی میں اتحاد جنس ہو جائے تو زیادتی ربٰو ہو جائے گی۔

مالکیہ کا مسلک: مالکیہ کے نزدیک روزی یا روزی بننے کی صلاحیت ہی حرمت ربٰو کی علت ہے۔

عبد الملک بن ماسجون کا مسلک: یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے فائدہ حاصل کیا جائے اس میں زیادتی ربٰو ہے۔ [تفسیر کبیر ج: ۷، ص ۹۴، دار الفکر بیروت)

یہ مسالک ومذاہب اختلاف علت کی وجہ سے وجود میں آئے، جن کے سبب بہت سے جزوی مسائل میں ائمہ کرام کے درمیان اختلاف رونما ہوا، جس کے نزدیک انتفاع والی چیز میں سود ہوتا ہے اس کے یہاں ربٰو کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا، مثلاً ایک آم دے کر دو آم لینا جائز نہ ہوگا کیوں کہ اس سے بھی فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک اس میں ربٰو نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ کیلی یا وزنی چیز نہیں ہے، یوں ہی شافعیہ کے نزدیک لوہا، تانبہ، پیتل، جستہ جملہ معدنیات نیز تمام ایسی چیزیں جن میں غذائیت نہیں ہوتی اور ساتھ ہی وہ ثمن نہیں بنتے

ان میں سود کا تحقق نہ ہو گا، اور حنفیہ کے نزدیک ان میں سود کا تحقق ہو گا، خلاصہ یہ ہے کہ اختلاف علت کی وجہ سے جزئیات میں اختلاف ہوااور اسی اختلاف کو دیکھکر دور حاضر کے کچھ لوگوں نے یہ استدلال کیاکہ سود کی حرمت ایسی قطعی اور لازمی نہیں ہے کہ تجارتی اشیامیں بھی سود ہواور اس سے آگے بڑھکر یہ بھی کہا گیاکہ جب اب تک یہی فیصلہ نہیں ہوپایاکہ کن کن چیزوں میں سود متحقق ہوتا ہے اور کن میں نہیں ہوتا، سود کے معنی ومفہوم میں جب اس قدر ابہام واجمال پایاجاتا ہے تواس کی وجہ سے زراعتی،صنعتی، تجارتی کاموں کے لیے جو سود لیاجاتا ہے وہ کیوں کرناجائز ہو گااور جدید بینک کاری جس کی بنیاد ہی زائدمال کے لینے پر ہے وہ کیسے حرام ہوگی، کیوں کہ موجودہ بینک کا نظام اگر بالکلیہ ختم ہوجائے توتمام صنعتی ادارے، تجارتی منڈیاں تباہ وبرباد ہوجائیں گی اور زراعت وصنعت کا کام بالکل ٹھپ پڑجائے گا، اس لیے جب سود مشتبہ چیز ہوئی جس کی حقیقت کے تعین سے علماے اسلام عاجزرہ گئے تواس کے سبب تمام کاروباری نظام کوکیوں کرتہس نہس کیاجاسکتاہے۔

جدید معاشیین اور اقتصادیات کے ماہر جو موجودہ بینک کاری کے بڑے زبردست وکلا اور پرجوش حمایتی ہیں وہ اس طرح کے مغالطہ آمیز دلائل سے مسلمانوں کے دلوں سے سود کی حرمت کا شدید احساس ختم کرنے کا ایک بہانہ ڈھونڈھتے ہیں، ورنہ اچھی طرح سے سمجھا جا سکتاہے کہ جس چیز کو عہد جاہلیت میں سود سمجھا گیااور جس کی حرمت کے بارے میں امت میں کبھی اختلاف نہیں ہوایعنی ربٰوالقرض یاربٰوالنسیئہ کے معنٰی میں کوئی ابہام کوئی اشتباہ نہیں رہا، یہی سود نزول قرآن کے وقت جاری تھااور اسی کواہل زبان نے سود سمجھا تھااور امت مسلمہ میں قرن اول سے لے کر موجودہ عہد تک کوئی اختلاف رونمانہیں ہوا، اور اسی سود کو مفکرین اسلام حقیقی سود قرار دیتے ہیں اور یہی وہ سود ہے جس کی حکمرانی ساری دنیاپر چھائی ہوئی ہے اور یہی وہ سود ہے جس کوارباب اقتدار دوسرے ممالک سے قرض لے کرادا کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے حکومتوں کی باگ ڈور ہمیشہ سود خوروں کے ہاتھ میں رہتی ہے، بھلا بتائیے کہ اس کے بارے میں کب اور کہاں علماے اسلام کے درمیان اختلاف ہوا، یہ توبالکل واضح تھا، لہٰذا اختلاف کا بہانہ بناکر حرمت کا احساس مسلم قوم کے دلوں سے ختم کرنا یہ مسلمانوں کے

ساتھ بڑی بے باکانہ جرءت ہے بلکہ غدارانہ حرکت ہے، یہ ان کے ساتھ خیر خواہی نہیں بلکہ ان کے دین کے منہدم کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش کے سوا کچھ بھی نہیں، دنیا میں صرف مسلمانوں کی مقدس کتاب ایسی ہے جس نے سود کی قباحت و مذمت اور اس کی حرمت کے بارے میں ایسے دلنشیں بیانات دیے جیسے بیانات دوسرے مذہبی صحیفوں میں نہیں پائے جا سکتے، انہیں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ہر دور میں اس کو گھناونا سمجھتے تھے اور اس کو بد ترین گناہ تصور کر کے اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، بلکہ اس کے نام ہی سے گھبراتے تھے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

بعض لوگ یہ شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر سود ایسی بری چیز ہوتی جس سے تباہی و بربادی کے دروازے کھلتے اور اس کے ذریعے انسانوں کو کچھ فائدہ نہ پہونچتا تو اب تک کاروباری دنیا میں ہلچل مچ جاتی، لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ اسی سود کی بدولت بڑی ترقیاں ہوئیں، کاروبار میں بڑا پھیلاؤ ہوا، کتنے بے روزگاروں کو روزگار ملا، کتنے مفلسوں کو ان کے افلاس و تنگدستی سے نجات ملی، پھر کیسے یقین کیا جائے کہ سود مکمل طور سے تباہی کا پیش خیمہ ہے؟

دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں جس میں نفع و نقصان دونوں نہ پائے جاتے ہوں، اگر سنکھیا زہر قاتل ہے تو اس کے بھی کچھ فوائد ایسے ہیں جن کے اچھے اثرات دواؤں میں ظاہر ہوتے ہیں، اگر شراب کی تباہ کاریوں سے بہت سے کنبے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ اس میں بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے، جبھی الکحل کی شکل میں دواؤں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، کتنی گندی اور فاسد چیزیں ہیں جن کے خیال ہی سے طبیعت میں انقباض پیدا ہوتا ہے، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جن سے یک گونہ فائدہ حاصل کیا جاتا ہے مگر ان فوائد و منافع سے یہ تمام گندی اور مہلک چیزیں ہر حالت میں مباح نہیں کی جاسکتیں، کیوں کہ اشیا کی حلت و حرمت کا معیار یا دارو مدار ان کے غالب فوائد یا نقصانات پر ہے، اگر کسی چیز کے اندر بے انتہا مضرتیں پائی جا رہی ہوں تو یہ نہیں کہا جاسکتا اس میں کچھ نفع ہے، اس لیے انسانوں کے لیے اسے جائز ہونا چاہئے، ٹھیک اسی طرح سود کے کچھ معمولی فوائد ہو سکتے ہیں اور ان فائدوں کی جھلکیاں بھی دکھائی پڑ سکتی ہیں، لیکن اس کی مضرتیں، اس کی تباہ کاریاں، اس کی نجاستیں، اس کی غلاظتیں اور اس کی قباحتیں اتنی زیادہ ہیں کہ عقل و خرد کا فیصلہ یہی ہونا چاہئے کہ کسی مجبوری کے بغیر کوئی ذی ہوش انسان اس کے قریب نہ پھٹکے، اگر ایک

طرف تم کو یہ نظر آتا ہے کہ کچھ بے روزگاروں کو روزگار مل رہا ہے تو دوسری طرف تم کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہئے کہ اس سے کتنے کنبوں کی تباہی و بربادی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں، اگر تم ایک طرف یہ دیکھتے ہو کہ اسی سود کی بدولت منڈیوں کی رونق برقرار ہے تو دوسری جانب تمہیں اس سے بھی آنکھیں بند نہیں رکھنا چاہئے کہ غریبوں، محتاجوں، کی ساری پونجی یا ان کی گاڑھی کمائی بلکہ ان کے خون کا آخری قطرہ سرمایہ پرستوں کی کوٹھیوں کی لالہ زاری میں اضافہ کر رہا ہے، حق یہ ہے کہ اس کے مفاسد کے مقابلے میں اس کے فوائد بہت کم ہیں لہٰذا اس کی ظاہری دیدہ زیبیوں اور دلفریبیوں سے اہل بصیرت کو دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔

اس کے علاوہ جو کچھ معاشی ترقیاں اور ان کے جلوے نظر آرہے ہیں وہ محض سودی کاروبار کی برکت نہیں ہے، زمانے کی رفتار انسان کی ذہنی نشوونما کا باعث ہوئی، اس لیے اپنے علمی اکتشافات سے عہد حاضر کے انسان نے سائنس اور فلسفے میں پیش رفت کرکے ایسے آلات ایجاد کیے جن سے اس کی معاشی ترقی کی رفتار تیز تر ہو گئی، پس تمام خوشحالیوں اور ترقیوں کا سہرا سود کے سر ڈالنا بالکل غلط ہے۔

والله أعلم بالصواب

باب چہارم

بینک کاری

ساری دنیا میں جتنے بینک کام کرتے ہیں ان کی بنیاد سود کے لین دین پر ہے، یہ سب غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہیں، اس لیے ان کی ضرورت کا کتنا ہی احساس دلایا جائے، تجارتی اور صنعتی مراکز میں ان کو کتنی ہی اہمیت حاصل ہو اور زراعت پیشہ لوگوں اور صنعت کاروں کو کتنا بڑا فائدہ پہنچ رہا ہو تاہم چوں کہ یہ سب اسلام کے احکام سے ٹکراتے ہیں اس لیے پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ان بینکوں میں روپیہ جمع کرنا کیسے جائز ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بینکوں میں روپیہ جمع کرنا سودی کاروبار کے فروغ میں ایک طرح سے معاونت ہے اور سودی کاروبار کی معاونت ناجائز و حرام ہے، چناں چہ اعلی حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالی عنہ کے بعض فتاوی سے ذہن اسی کی طرف جاتا ہے کہ موجودہ بینکوں میں سرے سے روپیہ جمع کرنے کا جواز ہی نہیں ہونا چاہیے، آپ سے سوال کیا گیا:

کیا فرماتے ہیں علماے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے کچھ روپیہ سودی نکلوایا، دو شخص ضامن ہوئے، اب گنہگار زیادہ کون ہے، وہ شخص جس نے سود پر دیا، اب توبہ کرتا ہے اور وہ سود کو واپس دینا چاہتا ہے، تو یہ توبہ اس کی قبول ہوگی یا نہیں اور وہ سود کے گناہ سے پاک ہوگا یا نہیں؟

امام احمد رضا رضی اللہ تعالی عنہ نے جواب میں ارشاد فرمایا: بغیر سخت مجبوری کے جسے شرع بھی مجبوری کہے سودی قرض لینا حرام ہے اور اسی طرح اس کے کام میں کسی طرح کی شرکت ہو باعث گناہ ہے، اور حدیث میں "هم سواء" فرمایا، کہ وہ سب گناہ میں برابر ہیں، اور سود سے توبہ کے یہی معنی ہیں کہ جس قدر سود لیا ہو واپس دے اور اللہ عزوجل سے آئندہ کے لیے نادم ہو کر عہد کرے، اس کی توبہ بے شک قبول ہوگی، هوالذی يقبل التوبه عن عباده، اور وہ سود کے گناہ سے پاک ہو جائے گا، التائب من الذنب كمن لا ذنب له۔ والله اعلم۔ [فتاوی رضویہ ج ۷ ص ۸۴، مکتبہ رضویہ، کراچی، پاکستان]

اس ارشاد مبارک کے الفاظ پر خصوصی توجہ دینی چاہیے کہ اسی طرح اس کے کام میں

کسی طرح کی شرکت ہو وہ سب نفس گناہ میں برابر ہیں۔

پنجاب کے کچھ مسلمانوں نے آج سے تقریبا اسی پچاسی سال قبل ضلع امرتسر میں ایک سودی بینک قائم کیا تھا، جس کا نام انہوں نے "امداد باہمی بینک" یا "کوآپریٹیو بینک" رکھا تھا، مسجد کے امام صاحب نے اس بینک کی ممبری قبول کرلی تھی اور روپیہ جمع کر کے سود لینے پر اصرار کر رہے تھے، اس پر فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ سے اس بینک اور مسجد کے امام کے بارے میں دو متدین عالم دین مولوی محمد عنایت اللہ صابری اور مولوی محمد اسماعیل صاحب چشتی نے ایک استفتا بھیج کر دریافت کیا، آپ نے جواب لکھا:

وہ بینک حرام قطعی اور یہ قواعد سب شیطانی ہیں اور اس کا ممبر بننا حرام ہے اور سود لینا دینا ضرور برابر ہے، صحیح مسلم میں امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے:" لعن رسول صلی اللہ علیہ وسلم أکل الربوا و مؤکله و کاتبه و شاهدیه وقال هم سواء۔ [مشکوۃ المصابیح، باب الربو، ج ۱، ص ۲۵۱، مکتبہ رحمانیہ]

تو امام مذکور کا اس بینک کی ممبری قبول کرنا حرام ہوا۔ قال الله تعالى :ولا تعاونوا على الاثم والعدوان ، حدیث میں ہے: من مشى مع ظالم ليعينه و هو يعلم انه ظالم فقد خلع من عنقه ربقة الاسلام ۔جس نے دانستہ ظلم پر اعانت کی اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے اتار دی اور شک نہیں کہ سود لینا ظلم شدید ہے، اس کا ممبر بننا اور اس کا ان سود خوروں کو روپیہ دینا اس ظلم شدید پر اعانت ہے اور معین مثل فاعل ہے، لہذا کاتب پر بھی لعنت فرمائی، تو اس کارکن بننے والا اور اس کے لیے روپیہ دینے والا ضرور کاتب سے لعنت کا بدرجہا مستحق ہوگا۔ [فتاوی رضویہ ج ۷ ص ۱۰۱۔۱۰۲]

فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کے اس فتوے پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس بینک کی بات ہے جس کے قائم کرنے والے مسلمان تھے اور انہوں نے سودی کاروبار کے لیے یہ بینک قائم کیا تھا، اس لیے مجدد اسلام نے ایسے بینک میں ہر طرح کی شرکت کو سودی کاروبار کی اعانت پر محمول کیا تھا اور اس کے لیے روپیہ دینے والوں کو لعنت کا مستحق بتایا تھا، اور مسجد کے امام کے پیچھے نماز کو مکروہ تحریمی اور قابل اعادہ بتایا تھا، اس سے یہ دلیل نہیں پیش کی جاسکتی کہ دنیا بھر

کے کسی بینک میں خواہ یہودیوں کے ہوں یا عیسائیوں کے، ہندوؤں کے ہوں یا پارسیوں کے اس میں روپیہ جمع کرنا ناجائز ہے، لیکن جب سودی کاروبار ہی کی وجہ سے روپیہ جمع کرنے کا جواز نہیں ہے تو اسی سود کی وجہ سے غیر مسلم بینکوں میں بھی روپیہ جمع کرنے کا جواز نہیں ہونا چاہیئے، چناں چہ اعلی حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ سے انگلش گورنمنٹ کی نگرانی میں قائم شدہ پنجاب و مدراس کے زراعتی بینکوں کے متعلق سوال کیا گیا تھا کہ:

گورنمنٹ کی نگرانی میں پنجاب و مدراس کے دیہات میں زراعتی بینک کھولے جاتے ہیں، زراعتی بینک کی غرض سود خوری نہیں ہوتی، بلکہ سود خور مہاجنوں سے قطع تعلق ہوتا ہے، سرکاری نام اس بینک کا "انجمن امداد قرضہ ہے" (ہیئت اس کی یہ ہے کہ) گاؤں کے لوگ بطور حصہ داری کے دس روپیہ سالانہ فی آدمی دس سال تک اس اپنی انجمن میں جمع کرتے ہیں اور اس انجمن سے حسب ضرورت قرض بھی لیتے ہیں، مگر قرض لینے کا حق محض حصہ داروں کو ہے، غیر حصہ داروں کو قرض ہرگز ہرگز نہیں دیا جاتا، مقروض جو کچھ رقم سود اس بینک کو دے گا وہ رقم بحیثیت رسد اس مقروض کے حصے میں بھی آئے گی، گویا سود دہندہ سود گیرندہ بھی ہے، اس انجمن کے پاس دس سال کے بعد کافی سرمایہ جمع ہو جاتا ہے، تو سود بہت کم یا بالکل موقوف کر دی جاتی ہے، یہ بینک جائز ہے یا ناجائز؟

تو آپ نے جواب میں جو کلمات ارشاد فرمائے اس کا تیور ملاحظہ فرمائیں:

حرام حرام حرام، قطعی یقینی حرام، دس برس تو بہت ہے، سود ایک لمحہ، ایک آن کو حلال نہیں ہو سکتا، احکام الہیہ کسی کی سب ترمیم سے بدل نہیں سکتے، اللہ عزوجل فرماتا ہے: "و احل الله البيع و حرم الربوا" صحیح حدیث میں ہے:" لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم أكل الربوا و مؤكله و شاهديه و قال هم سواء"یہاں کہ سود دہندہ ہی سود گیرندہ بھی ہے معنی یہ کہ ڈبل ملعون ہے، جو براہ شامت نفس اس کا ارتکاب کرے اور حرام جانے وہ فاسق و فاجر ہیں۔ العیاذ باللہ۔ [فتاوی رضویہ ج۷ ص۱۰۱]

مجدد اسلام رضی اللہ عنہ کے ان فتاوی سے اگرچہ صراحۃً نہ سہی، اشارۃً ضرور معلوم ہو رہا ہے کہ سودی کاروبار کرنے والے بینکوں میں روپیہ جمع کرنا اصالۃً جائز نہیں ہے، خواہ یہ

بینک امداد باہمی کے لیے مسلمانوں نے خود قائم کر رکھا ہو یا یہ بینک کافروں کے ہوں ہر حالت میں سودی کاروبار کرنے والوں کے پاس اپنا روپیہ جمع کرنا اور ان کو سودی کاروبار میں لگانے کی اجازت دینا جائز نہیں ہوسکتا۔ لیکن اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد حاضر میں بغیر بینکوں میں روپیہ جمع کیے تجارت کرنا بڑا دشوار امر ہے، روپیوں کا تبادلہ یا لین دین بذریعہ بینک ہوتا ہے، تو اگر بینکوں میں روپیہ جمع کرنے کا جواز نہ ہو تو کاروباری لوگوں کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، پھر اپنے مال اور اپنے سامانوں کی حفاظت اگر خود کی جائے تو مال کے علاوہ جان کا بھی خطرہ ہوسکتا ہے، اس صورت حال میں بینکوں میں روپیہ جمع کرنا (اس نیت سے نہیں کہ سودی کاروبار میں میرا بھی سرمایہ لگے گا بلکہ اس نیت سے کہ میرے سرمائے کی حفاظت ہوگی اور مجھ کو تجارتی سہولتیں حاصل ہوں گی) جائز ہونا چاہیے، چناں چہ متذکرہ بالا وجوہات کی بنا پر بینکوں میں روپیہ جمع کرنے کے جواز کا فتویٰ مفتیان کرام نے دیا ہے۔

عجیب وغریب سوال:

بینکوں میں روپیہ جمع کرنے کا سوال عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے، شاید ہی کوئی شخص ہو جو اس بات کو سن کر اچنبھا نہ ہو کہ بینکوں میں روپیہ جمع کرنا اصالتہً ناجائز ہے، اس لیے کہ موجودہ ماحول میں تمام کاروبار یا تجارتی لین دین کا دارومدار بینکوں ہی کے ذریعے ہے، پھر یہ مسئلہ اٹھانا کہ ان میں روپیہ جمع کرنا جائز ہے یا ناجائز، کچھ حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامی سود کے معاملے میں جتنی حساس ہے اس کے پیش نظر یہ امر تعجب خیز نہیں ہے، بلکہ حیرت افزا بات یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال کیوں نہیں ابھرتا، اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر چند افراد ایک ایسے مکان میں رہتے ہوں جہاں چاروں طرف بدبو پھیلی ہوئی ہو اور تعفن سے اس مکان کے اندر باہر سے آنے والوں کے لیے داخل ہونا دشوار ہو رہا ہے، لیکن جو اس مکان میں رہنے والے ہیں جب اس بدبودار ماحول کے عادی ہوگئے اور یہاں قیام کرنا ان کی طبیعت پر کچھ بھی گراں نہیں گزرتا، اب اگر کوئی دوسرا شخص جو صاف ستھرے ماحول کا رہنے والا ہو ان مکان والوں سے یہ کہے کہ یہ عمارت رہائش کے قابل نہیں ہے، اس میں تو اتنی بدبو پھیل رہی ہے کہ دماغ پھٹا

جاتا ہے، اس میں مہلک جراثیم پیدا ہو گئے ہیں جو صحت کے لیے نہایت مضر ہیں، بلکہ ہلاکت کا باعث ہو سکتے ہیں تو ایسے گھر والوں کو ضرور تعجب ہو گا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ شخص لایعنی گفتگو کرتا ہے یا مبالغہ آمیز باتیں کہتا ہے، بلا سبب اس مکان کو ناقابل رہائش بتاتا ہے، ٹھیک اسی طرح موجودہ اقتصادی و معاشی دنیا سود کے بدبودار ماحول میں رہتی ہے، اس کے جتنے فلک بوس غلاظتوں کے "مراکز و مزابل" بنے ہوئے ہیں جن کو مصارف مالیہ یا بینکوں کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ان کی غلاظتوں اور بدبوؤں سے سارا ماحول گندگی سے بھر گیا ہے، اس لیے جب کوئی شخص اسلام کے صاف ستھرے نظام کو پیش کرنا چاہے گا اور ان کو یہ تلقین کرے گا کہ یہ بینک نجاستوں کے مرکز ہیں، تم کو اپنا پاک اور طیب سرمایہ بلا ضرورت یہاں نہیں جمع کرنا چاہئے تو بجائے اس کے کہ ایسے بہی خواہ اور ہمدرد کی بات سن کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے الٹے یہ بات دہرائی جائے گی کہ یہ مولانا ہیں، جدید ترقیاتی کاموں کے دشمن ہیں، یہ مسلمانوں کو دقیانوسیت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، یہ بنیاد پرستی اور احیا پرستی کی بیماری میں مبتلا ہیں، اگر ان کی بات سن کر اس پر عمل کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ زندگی کے ہنگاموں سے الگ تھلگ ہو کر صرف زاہد و راہب بن کر زندگی گزارنی چاہئے، اس لیے خبردار! خبردار! ان کی باتوں کی طرف دھیان نہ دینا۔

ایک علمی لطیفہ:

اس موضوع پر ایک عالم دین سے گفتگو ہوئی جو غیر مقلد یا وہابی دیوبندی نہیں تھے بلکہ الحمد للہ ایک متصلب سنی تھے، شرعی مسائل سے متعلق اچھی خاصی معلومات رکھتے تھے، تو انھوں نے فرمایا کہ کافروں کا بینک اگرچہ بظاہر سودی کاروبار کرتا ہے لیکن در حقیقت وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے خیال و عقیدے کے مطابق جائز سمجھ کر کرتا ہے تو ان کا باہمی کاروبار خواہ سو روپے دے کر ایک ہزار روپے لیں شرعی نقطہ نگاہ سے سود کے دائرے سے خارج ہے، پھر جب کافروں کے بینک سود کے دائرہ عمل سے باہر ہو گئے تو ان میں روپیہ جمع کرنا سودی کاروبار میں اعانت نہیں ہے، جو گناہ عظیم ہے اور انھوں نے آگے بڑھ کر یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان ہندوستان کے کافروں کے بینک سے قرض لے کر زائد رقم دے تو اگرچہ ناجائز حرام ہے کیوں کہ کافروں کی اعانت ہے، لیکن یہ زائد رقم سود نہیں ہے، لا الہ الا اللہ۔

اس ناچیز کو ان کے علم و فضل پر کبھی شبہ نہیں ہوا لیکن ان کی اس دلیل سے بڑی حیرانی ہوئی، میں نے ان کو بتایا کہ اس صدی کے مجدد امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالی عنہ نے اپنی تصنیفات میں بالخصوص فتاویٰ رضویہ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ کفار و مشرکین بھی شرعی احکام کے مکلف ہیں، چناں چہ امام فرماتے ہیں:

یہاں تک کہ مذہب معتمد میں کفار خود بھی مخاطب بالفروع ہیں،حتی العبادات اداء واعتقادا فیعذبون علی ترک الاداء ایضاً لقوله تعالی :قالوا :لم نک من المصلین۔ [فتاوی رضویہ ج۷ ص۸۹]

اس لیے ان کے مابین بھی سودی کاروبار کا تحقق ہوگا، پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ تاریخی شہادت سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کو بھی سود کی حرمت کا مخاطب بتایا، باقی رہی بات کہ کفار و مشرکین سے قرض لے کر یا بینکوں سے زائد ادائگی کی شرط کے ساتھ قرض لے کر ان کو زائد دینا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالی عنہ کی تصریحات کے مطابق یقیناً سود ہیں، مجھ کو بڑی سخت حیرانی اس مسئلے پر ہوئی کہ کافروں سے قرض لے کر زائد رقم دینا سود کی وجہ سے حرام نہیں ہے، بلکہ حربی کافر کی اعانت کی وجہ سے حرام ہے، اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالی عنہ کے ذیل کے فتاوی اگر نگاہ میں رہیں تو کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہیں رہے گا۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایا سرزمین ہندوستان میں بحالت موجودہ مسلمانوں کو اپنی قومی حالت سنوارنے کی غرض سے سود کا لین دین جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سود دینے سے قومی حالت سنورتی تو لاکھوں مسلمان بنیوں کو سود دیتے ہیں اور اپنی جائیدادوں کو تباہ کرتے ہیں، ہزاروں کا مال دوڈھائی سو میں بہ جاتا ہے، کیا اسی کو حالت سنوارنا کہتے ہیں؟۔ [فتاویٰ رضویہ ج۷ ص۹۸]

سوال: ہندو سے نقد قرض سودی مسلمان کو لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سود جس طرح لینا حرام ہے یوں ہی دینا حرام ہے، جب تک سچی حقیقی مجبوری نہ ہو۔ [فتاویٰ رضویہ ج۷ ص۹۳]

مجدد اسلام کے ان فتاویٰ سے ثابت ہوا کہ اسے زائد رقم دینا بطور سود بھی حرام ہے، نہ محض بطور اعانت، غرض میرے نزدیک کافروں کے بینک ہوں یا مسلمانوں کے ان میں اپنے طیب و طاہر مال کو جمع کرکے ان کے سودی کاروبار کی نجاستوں سے آلودہ رقم حاصل کرنا اسی وقت جائز ہوگا جب کہ جمع کرنے کی ضرورت ہو اور ضرورت کے بغیر بینکوں میں روپیہ جمع کرنا اصالۃً جائز نہیں۔

مجھے ان علمائے کرام کے فتاوے پر مکمل اعتماد ہے جو بینکوں میں روپیہ جمع کرنے کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں کیوں کہ میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں کہ ایک عذر معقول کی بنا پر فتویٰ ہے۔

بینکوں کی زائد رقم کا حکم:

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہندوستانی بینکوں میں روپیہ جمع کرنا عذر معقول کی بنا پر جائز ہے تو اب سوال آتا ہے کہ ہندوستان کے جتنے بینک ہیں ان پر کافروں کا قبضہ ہے یا حکومت ہند کی ملکیت ہیں اور اسی کے زیر نگرانی اپنا سودی کاروبار جاری رکھتے ہیں، ایسے بینکوں میں روپیہ جمع کرکے زائد رقم لینا جائز ہے یا ناجائز، یہاں یہ بحث کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام بے فائدہ ہے، کیوں کہ سود کی حرمت مکان کی حدبندیوں میں محصور نہیں ہے، سود جیسے دارالاسلام میں حرام ہے اسی طرح دارالحرب میں بھی حرام ہے، اگرچہ ہندوستان کے بعض اہل علم کو اس بارے میں بڑا اشتباہ رہا اور انہوں نے یہ کہا کہ اگر ہندوستان کو دارالاسلام مان لیا جائے تو یہاں کے کافروں یا بینکوں سے زائد رقم لینا جائز نہیں ہوگا کیوں کہ دارالاسلام میں سودی کاروبار ممنوع ہے لیکن اگر ہندوستان کو دارالحرب تصور کرلیا جائے تو یہاں کے کافروں سے زائد رقم لینا اس لیے جائز ہوگا کہ یہ سود کے دائرے میں داخل نہیں ہے۔

مجدد اسلام جیسے دوسرے شرعی احکام میں اپنی تحقیق کو آخری منزل تک پہونچاکر حق کو واضح کرکے اپنے مد مقابل کو لاجواب کردیتے ہیں اسی طرح اس مسئلہ میں بھی انہوں نے اپنے متعدّد فتاوی میں جو سیر حاصل بحث کی ہے اور اعلیٰ درجہ کی تحقیق پیش کی ہے اس میں نہ

صرف یہ کہ وہ گوے سبقت آگے لے گئے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر دیانت دارانہ ذہن سے غور کیا جائے یا تعصب و تنگ نظری سے اپنے کو دور رکھا جائے تو انہیں کی تحقیق قابل اعتماد ہے، اس لیے علماے اہل سنت کے لیے ہندوستانی بینکوں سے زائد رقم لینے کے بارے میں زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ مجدد اسلام کی تحقیق پر اعتماد کلی کرنا چاہئے۔

امام احمد رضا رضی اللہ عنہ کے بعض ان فتاوے کو جو بینکوں کے بارے میں مجملاً یا مفصلاً ہیں ان کو جمع کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں اور میں ان کے فتاوے کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہوں۔

ا۔ ایسے فتاوے جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کے بینکوں اور غیر مسلموں سے زائد رقم لینا سود کے زمرے میں داخل ہے حالاں کہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔

۲۔ ایسے فتاوے جن سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں یا بینکوں سے زائد رقم لینا سود کے دائرے میں داخل نہیں ہے۔

نوع اول:

قسم اول کے فتاوے حسب ذیل ہیں:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماے دین اس مسئلے میں کہ ہنود سے سود لینا درست ہے یا نہیں؟

جواب: ہندو مسلمان سے کسی سے درست نہیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماے دین اس مسئلہ میں کہ جو روپئے کفار کے خزانے میں جمع کر دیئے جائیں اس کا سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سود لینا قطعاً حرام ہے، اللہ عزوجل نے مطلقا فرمایا: **و احل اللہ البیع و حرم الربٰو**، اللہ نے بیع حلال کی اور حرام کیا سود، اس میں رب العزت جل جلالہ نے تخصیص نہ فرمائی کہ فلاں سے سود لینا حرام ہے اور فلاں سے سود لینا حلال ہے بلکہ مطلقاً حرام فرمایا، کافر سے ہو خواہ مسلمان سے، ہاں اپنا کسی پر آتا ہو یا اور کوئی مال جائز حیلہ شرعیہ سے حاصل کرنا دوسری بات ہے۔ [فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۹۱ مکتبہ رضویہ کراچی پاکستان]

سوال: بینک سے سود لینا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب: سود لینا مطلقاً حرام ہے، قال اللہ تعالیٰ: **و حرم الربٰو** [فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۹۱]

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ایک شخص کہتا ہے یہاں کے ہنود سے سود لینا جائز ہے، مسلمانوں سے نہیں، یہ قول کیسا ہے؟

جواب: سود لینا نہ مسلمان سے جائز ہے نہ ہندو سے، لاطلاق قولہ تعالیٰ: و حرم الربٰو، اما مایؤخذ من الحربی فی دارالحرب فمال مباح لیس بربا۔ [فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۸۶]

ان جوابات سے بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد اسلام رضی اللہ عنہ کا مسلک یہی ہے کہ بھارت کے غیر مسلموں کے یہاں اور ان کے بینکوں میں روپیہ جمع کر کے زائد رقم لینا سود ہے جو قطعاً ناجائز و حرام ہے مگر یہ سب فتاوے مختصر اور مجمل ہیں۔

نوع دوم :

اب آپ ایک نظر ان کے دوسری قسم کے فتاوے پر ڈال لیں جو مفصل و مدلل ہیں، جن سے واضح طور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں اور ان کے بینکوں سے اضافہ کی جو رقم لی جاتی ہے وہ در حقیقت مال مباح ہے سود نہیں ہے۔

دوسری قسم کے فتاوے حسب ذیل ہیں:

سوال: ڈاک خانہ سرکاری کے سیونگ بینک میں دوسرے انگریزی تجارتی بینک میں زید نے کچھ روپیہ داخل کیا جس پر بہ شرح متعیّنہ گورنمنٹ نے یا تاجر انگریز نے منافع ادا کیا تو جمع کرنے والا شخص مطابق احکام شریعت اس منافع کو لینے کا مستحق ہے یا نہیں۔؟

جواب: سود مطلقا حرام ہے، مگر جس کے یہاں روپیہ جمع کیا اگر کوئی مطالبہ شرعاً آتا تھا اور وہ اور طور سے نہ مل سکتا تھا (یعنی دوسرے طریقے سے نہ مل سکتا تھا) اور اس نام سے وصول ہو جائے تو اپنے حق کی نیت سے قدر حق لینے کا استحقاق ہے اور اگر کچھ نہ آتا تھا مگر کوئی مال مباح بلا غدر و بلا ارتکاب جرم بہ رضامندی ہاتھ آتا ہو تو بہ نیت مباح اسے لینے والے کو مباح ہے اگرچہ دینے والا اسے کسی نام سے تعبیر کرے۔ [فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۹۷]

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ امام احمد رضا کا یہ فتوی انگریزوں کے عہد حکومت میں انگریزوں اور ان کے بینکوں کے متعلق تھا ہندوستان کے ہندوؤں کے بارے میں نہیں تھا اس لیے ان غیر مسلموں کے بارے میں کیا حکم ہے اس فتویٰ کی روشنی میں اس کی وضاحت نہیں ہو رہی ہے، تو اسے ذیل کا فتویٰ ملاحظہ کرنا چاہئے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص مسلمان اہل سنت و جماعت پکا حنفی ہے، اگر یہ شخص مذکور کفار مثل نصاریٰ و ہنود و رافضی و خارجی سے سود لیوے اور کفار مذکور کی رضا سے لیوے، بطور تجارت روپیہ کمانے کو، نیز اس مسلمان سود گیرندہ کی نیت یہ ہو کہ کسی وقت میں کسی مسلمان سے سود نہ لیا جاوے تو اس صورت میں اس مسلمان کو کفار مذکور سے سود لینا جائز ہے یا ناجائز؟ جو حکم شرع شریف ہو بلا تاویل و بلا خوف ملامت علما خاص و عام ارسال فرمایا جاوے۔

جواب: اللہ عزوجل نے مطلقا فرمایا: **و حرم الربو**، اور اللہ نے سود حرام کیا، اس میں کوئی تخصیص مسلمان، کافر، سنی، بدمذہب کسی کی نہیں ہے، سود لینا کسی سے حلال نہیں، جو حلال ہے وہ سود نہیں ہے اور جو سود ہے وہ حلال نہیں، کافر غیر ذمی کا مال جو بلا غدر حاصل ہو وہ مال مباح سمجھ کر لینا حلال ہے، سود جان کر لینا حرام، قصد معصیت خود معصیت ہے، مثلاً کافر سے کوئی مال سو روپے کا خریدا اور قیمت دبالی یا دھوکہ دے کر کھوٹے دام دیئے یہ ناجائز ہے کہ خلاف معاہدہ ہوا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "**یاایھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود**"[سورہ مائدہ، آیت ۱، پارہ ۶] اور اگر چاندی کا دو سو روپیہ بھر مال سو روپے کا مول لیا اور یہ سمجھا کہ سو روپے ہی کے بدلے سو روپئے ہو گئے، باقی کافر کا مال بلا غدر اس کی مرضی سے ملتا ہے تو جائز جب کہ وہ کافر ذمی یا مستامن نہ ہو۔[فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۱۰۱]

اس فتوے سے یہ معلوم ہوا کہ انگریز ہی کا مال مباح نہیں ہے بلکہ ہر کافر خواہ انگریز ہے یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا کافر سب کا مال مباح ہے، شرط یہ ہے کہ مستامن یا ذمی نہ ہو، اور غدر سے مال نہ لے رہا ہو۔

سوال: سود لینا مسلمان کو کسی قوم سے جائز ہے یا نہیں اور سود کس کس قسم سے ہوتا ہے، مشرح بیان فرمایا جاوے۔

کسی بینک میں روپیہ جمع کرکے اس سے سود وصول کرنا بموجب اس کی شرح کے جائز ہے یانہیں یاکسی انجمن کاروپیہ ڈاک خانے میں جمع کرکے اس سے سود لے سکتا ہے یانہیں یا کوئی تجارت اس طرح کی کرے کہ جو اس قدر روپیہ جمع کرے (یعنی جو اتنا روپیہ جمع کرے مثلاً ہزار دو ہزار) اس کو اتنے سیکڑے کا سود دیں گے نقصان کا وہ شریک نہیں اور اس کو نقصان سے کچھ مطلب نہیں (یعنی روپیہ دینے والا روپیہ دے کر آزاد ہوجائے اور اس کو نقصان سے کچھ مطلب نہ رہے) بلکہ فیصد وہ سود لیتا رہے اور روپیہ جمع کرنے والا سود جان کر نہ لے اور نقصان بھی نہ دے تو حلال ہے کہ حرام یاکسی دوکان دار کو بموجب نفع کے دیوے، نقصان کا شریک نہ ہو وہ نفع حلال ہے یانہیں؟

جواب: سود لینا مطلقاً حرام ہے، مسلمان سے ہو یا کافر سے، بینک سے ہو یا تاجر سے، جتنی صورتیں سوال میں بیان کی ہیں سب ناجائز ہیں، قرض دے کر اس پر کچھ نفع بڑھا لینا سود ہے، یا ایک چیز کو اس کی جنس کے بدلے ادھار بیچنا (مثلاً گیہوں کو گیہوں کے بدلے ادھار بیچنا اگرچہ کیل میں برابر ہوں) یا دو چیزیں کہ دونوں تول سے بکتی ہوں۔ (مثلاً لوہا، تانبہ) یا دونوں ناپ سے بکتی ہوں مثلاً گیہوں اور جو، ان میں سے ایک کو دوسرے سے ادھار بدلنا یا ناپ تول کی چیز کو اسی کی جنس سے کمی بیشی کے ساتھ بیچنا یہ سب صورتیں سود کی ہیں اور جو شرعاً سود ہے اس میں یہ نیت کر لینا کہ سود نہیں لیتا ہوں کچھ اور لیتا ہوں محض جہالت ہے، ہاں وہاں یہ نیت کام دے سکتی ہے جو واقع میں سود نہ ہو اگرچہ دینے والا اسے سود سمجھ کر دیوے، مثلاً کسی کافر کے پاس یا کوٹھی یا بینک میں (بشرطے کہ اس میں کوئی مسلمان شریک نہ ہو) روپیہ جمع کر دیا اور اس پر جو نفع کافر نے اپنے دستور کے مطابق دیا اسے اپنے روپئے کا نفع اور سود خیال کرکے نہ لیا بلکہ یہ سمجھ کر کے لیا کہ یہ مال مباح ہے بہ رضائے مالک ملتا ہے تو اس میں حرج نہیں۔ [فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۱۰۲۔۱۰۳]

اس فتوے سے حسب ذیل امور ثابت ہوئے:

الف۔ جو چیز سود کے دائرے میں آتی ہوں اس کے بارے میں کسی کی نیت کیسی ہی ہو اس کے لینے سے سود کے گناہ سے نہیں بچ سکتا۔

ب۔ جو چیز سود نہ ہو اگر کوئی شخص سود کے لفظ سے تعبیر کر کے دے تو فی الواقع سود نہ ہو گا لیکن اگر لینے والا سود سمجھ کر لے تو وہ ضرور گنہگار ہو گا۔

ج۔ کافر کا مال خواہ اس کے بینک کا ہو اگر کوئی مسلمان مال مباح سمجھ کر کرلے لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ان تفصیلی دفعات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر کافر حربی کا یہ حکم ہے، اس کا مال مباح سمجھ کر لینا جائز ہے، اس میں ہندو یا انگریز کی کوئی قید نہیں۔

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں۔

ا۔ رافضی بوہرے کافر ہیں یا مرتد، بہر دو صورت اگر مسلمان ان کے ساتھ یا ہندو کافر کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرے (مثلاً ہزار یا پانچ سو روپے تجارت کے لیے رافضی کو دے اس شرط پر کہ (گڑ اور شکر میں نقصان کی صورت نہیں ہوا کرتی الاشاذ و نادر ہے) میں تجھ سے ڈیڑھ یا دو سو روپے فیصد ماہوار کے اعتبار سے نفع نقصان کا اوسط نکال کر تیری دکان سے نقد یا سامان خوردنی لیتا رہوں گا، اور یہ مضمون بطور شرط کاغذ پر لکھوا کر عرصہ تک اسی طرح باہمی معاملہ جاری رہے اور راس المال محفوظ سمجھ کر بعوض نفع حسب شرط باہمی اشیائے خوردنی و پوشیدنی وہ لیتا رہے اور مابقی نقد لے تو جائز ہے یا ناجائز اور ناجائز ہو گا تو سود ہو گا یا کیا؟

۲۔ اسی طرح کافر کو مال دو مہینے کے وعدے پر قرض فروخت کرے اور اس کے ہاتھ سے اپنے بھی کھاتے میں لکھوا لے تو بوقت ادائے روپیہ فیصد آٹھ آنے یا ایک روپیہ ماہوار راس المال کے زائد ادا کروں گا۔

جواب: بوہرے رافضی مرتد ہیں اور ہر مرتد کافر ہے، بلکہ کافروں کی بدتر قسم، یہاں کے ہنود وغیرہ جتنے کفار ہیں ان میں نہ کوئی ذمی ہے کہ سلطنت اسلام میں مطیع الاسلام و جزیہ گزار ہو کر رہے، نہ مستامن ہے کہ بادشاہ اسلام سے کچھ دنوں کے لیے امان لے کر دار الاسلام میں آئے اور جو کافر نہ ذمی ہو نہ مستامن ہو سوائے غدر اور بد عہدی کے کہ مطلقاً ہر کافر سے حرام ہے، اس کی رضا سے اس کا مال جس طرح ملے جس عقد کے نام سے ہو مسلمان کے لیے حلال ہے۔ آگے چل کر تنبیہا ارشاد فرماتے ہیں: البتہ ان تمام صورتوں میں یہ لحاظ رہے کہ یہ ذی عزت متقی آدمی جسے جاہل عوام اپنی نافہمی کے سبب ایسی صورتوں میں معاذاللہ سود خور مشہور کرے اس سے احتراز مناسب ہے کہ جیسے برے کام سے بچنا ہے برے نام سے بچنا ہے۔

اس تفصیلی فتوے نے اس حقیقت کو ظاہر کر دیا کہ کافر حربی سے زائد مال مل رہا ہو وہ بھی اس کی رضا سے جس میں کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہ ہو وہ سود نہیں ہو گا لیکن یہ بھی تنبیہ فرمادی گی کہ اگر اس قسم کی رقم لینے سے کسی کی عزت و وقار پر دھبہ آئے یا اس کے متعلق یہ مشہور ہو جائے کہ وہ سود خور ہے تو اس کو بچنا چاہیئے یعنی اس مال مباح کو اپنی ضرورت کے لیے نہیں لینا چاہیے بلکہ لے کر غریبوں میں تقسیم کر دینا چاہئے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں فضلائے کرام، کیا ہندوستان میں حربیوں سے سود لینا جائز ہے، خواہ وہ ہندو ہوں یا نصرانی یا اس کے علاوہ بشرطے کہ ذمی نہ ہوں؟

جواب: الحمد للہ ہندوستان دارالاسلام ہے، کیوں کہ بہت سے شعائر اسلام باقی ہیں اور جب تک ان کا کچھ حصہ باقی رہے گا یہ دارالاسلام ہی رہے گا، اس لیے کہ اسلام غالب رہتا ہے اس کو مغلوب نہیں کیا جاسکتا، رہا سود لینے کا معاملہ تو واضح ہے کہ وہ مطلقاً ناجائز ہے، کیوں کہ آیات و احادیث تحریم ربا مطلق ہیں (ان میں یہ قید نہیں لگی ہے کہ مسلمان سے حرام ہے یا کافر سے نہیں) اور فقہائے کرام نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ دارالحرب میں زیادہ لینا جائز ہے تو اس کا سود سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ ربا صرف مال معصوم میں ہوتا ہے اور حربی کا مال غیر معصوم ہے، یہاں تک کہ جو شخص حربیوں میں سے مسلمان ہو کر وہیں رہ گیا اور وہ دارالاسلام میں ہجرت کر کے نہیں آیا تو اس کے مال کا لینا مالِ مباح کا لینا ہے نہ کہ سود کا لینا ہے، اسی وجہ سے ارباب تحقیق فرماتے ہیں کہ دارالحرب میں ربا نہیں ہے وہ یہ نہیں کہتے ہیں کہ دارالحرب میں ربا جائز ہے، یوں ہی وہ یہ کہتے ہیں کہ آقا اور اس کے غلام کے درمیان سود نہیں ہے اور وہ یہ نہیں کہتے کہ اپنے غلام سے آقا کے لیے سود لینا جائز ہے، سود کے نام کا اطلاق اگر اس پر کیا گیا ہے تو ظاہر کے لحاظ سے کیا گیا ہے، (اور واقعہ اور حقیقت کے اعتبار سے نہیں کیا گیا ہے) اور شرعی احکام حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ حکم ہر حربی غیر مستامن کے لیے عام ہے، اگرچہ وہ دارالاسلام میں ہو کہ اس کا مدار "عدم عصمت" ہے اور وہ سب کو شامل ہے، ہمارے لیے صرف غدر کی وجہ سے حرام ہو گا، پھر جب تم اس سے آگے بڑھ گئے اور تم نے اس سے لے لیا، کسی عقد کے نام پر لے لیا تو تم نے مالِ مباح لیا، اس سلسلے میں تمھارے اوپر کوئی حرج و گناہ نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غلبۂ روم کے

بارے میں کفار مکہ سے بازی لگائی تھی اور سرکار کی اجازت سے ان کا مال لے لیا تھا، یہ مال لینا ان کے لیے جائز تھا کہ ان کا مال غیر معصوم تھا، ورنہ یقینا یہ حرام جوا ہوتا، اس باب میں یہ قاعدۂ کلیہ ہے، جس نے اس کا احاطہ کر لیا تو اس پر دوسرے جزئیات کا استخراج مشکل نہ ہوگا ،ہم نے اپنے فتاویٰ میں اس کو تفصیلاً بیان کر دیا ہے ،البتہ یہاں دو نکتے ہیں، جن پر آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔

ا۔ موضع تہمت میں ان لوگوں کا بچنا ضروری ہے جو کھلم کھلا اچھی نیت سے یہ زیادتی لینا چاہتے ہوں،اس لیے کہ اس کا لینا حلال ضرور ہے لیکن عوام متہم کریں گے کہ یہ سود خور ہے لہٰذا جو لوگ دینی حیثیت سے عزت دار اور مقام بلند رکھتے ہوں ان کو اس سے اجتناب ضروری ہے۔

۲۔ بعض وہ صورتیں جو مباح ہوتی ہیں لیکن قانون کی نگاہ میں وہ جرم ہوتی ہیں تو ان کے ارتکاب سے اپنے کو اذیت میں پیش کرنا ہے اور ذلیل کرنا ہے ایسی صورتوں سے احتراز لازم ہے، ان کے علاوہ مباح اور خوش گوار ہیں جن میں کوئی رکاوٹ اور تنگی نہیں ہے ،البتہ جس نے کافروں سے زائد رقم لی اور اس کی نیت سود لینے کی تھی تو وہ قصد معصیت کی وجہ سے گنہ گار ہوگا ،سرکار نے ارشاد فرمایا:(انما الاعمال بالنیات و لکل امرئ مانویٰ)مثلاً فقہاے کرام نے اس مسئلے میں صراحت کی ہے کہ اگر کسی شخص نے طاق میں رکھے ہوئے کپڑے کی طرف قصداً دور سے اس گمان سے دیکھا کہ وہ اجنبی عورت ہے تو ایسا شخص اس قصد کی وجہ سے گنہ گار ہوگا ،اگر چہ فی نفسہٖ کپڑے کی طرف دیکھنا بالکل مباح ہے۔[فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۱۱۴۔۱۱۵]

اس مفصل فتوے سے بعض اہم نکات سامنے آئے:

الف۔ حربی سے زائد رقم لینا اگرچہ سود نہیں ہے تاہم اگر کوئی شخص سود سے تعبیر کرے اور یہ کہے کہ کافر سے سود لینا جائز ہے یا ناجائز؟ تو قانونی اور شرعی الفاظ میں یہی جواب دیا جائے گا کہ کسی کافر سے سود لینا جائز نہیں ہے، الفاظ تعبیر کے فرق سے فتوے کے قانونی الفاظ میں تفاوت پیدا ہونا لازمی ہے۔

ب۔ جو لوگ سماج و سوسائٹی میں دینی حیثیت سے اعلیٰ درجے پر فائز ہوں اور ان کو عزت و وقار کا مقام بلند حاصل ہو نیز ان کی شخصیت پر مسلمانوں کو اعتماد کلی ہو تو ان کو خواہ مخواہ امر

مباح پر عمل کر کے اپنی عزت و وقار کو مجروح نہیں کرنا چاہئے ،اور نہ اپنے کو مطعون کرنا چاہئے ،جب کہ اس امر مباح کو اپنی جہالت اور بے علمی کی بنا پر عوام کالانعام برے الفاظ سے تعبیر کرتے ہوں۔

ج۔اگر کوئی کام نفس الامر میں مباح ہو مگر اس مباح کو حرام سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے تو ایسی صورت میں معصیت کا ارتکاب ہو جائے گا۔

د۔بعض چیزیں شرعاً مباح ہوتی ہیں لیکن ملکی قانون کی نگاہ میں وہ جرم قرار پاتی ہیں تو ان کے ارتکاب سے بچنا ضروری ہے ،مثلاً غیر ملک سے کپڑا یا اور کوئی سامان لانا کسٹم کے قانون کی خلاف ورزی ہے تو اس سے احتراز لازمی ہے۔

امام احمد رضا کے فتاوےٰ میں کامل توافق:

یہ ہیں مہمات نکات جو فاضل بریلوی جیسی عظیم شخصیت کی نگاہ میں رہے اور یہیں سے یہ پیچیدگی بھی حل ہو گئی کہ آپ کے کچھ فتاوے میں جو یہ موجود ہے کہ بینک سے سود لینا حرام ہے ،یا آپ کے ارشادات عالیہ میں جو یہ پایا جاتا ہے کہ ہندوؤں سے سود لینا حرام ہے ،وہ اس نکتے کے پیش نظر تھا کہ ایک امر مباح کو حرام جان کر لینا چوں کہ ناجائز تھا اور استفسار کرنے والے نے اس کو سود کے لفظ سے تعبیر کیا تھا اس لیے آپ نے اپنی پہلی قسم کے فتاوے میں اس کو حرام بتایا تھا اور آپ کا یہ ارشاد بجا تھا اور جب آپ سے یہ دریافت کیا گیا کہ کافروں کو قرض دے کر ان سے زائد رقم لینا سود ہے کہ نہیں ؟ یا بینکوں سے زائد رقم لینا سود کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں ؟ تو آپ نے دوسری قسم کے فتاویٰ میں اس بات کو کھول کر بتایا کہ کافروں کا مال لینا چوں کہ مباح ہوا کرتا ہے جب کہ وہ ذمی یا مستامن نہ ہوں اس لیے اس کے لینے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ،بشرطے کہ اپنی عزت و آبرو محفوظ رہے ،اور اس کی رضا سے لے رہا ہو،اس سے کوئی غدر یا عہد شکنی نہ ہو رہی ہو،کیوں کہ یہ مال سود نہیں ہے ،جس کی مذمت اسلامی شریعت میں بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی ہے ،اور جس کی قباحتوں کا بیان نہایت موثر اور بلیغ انداز میں ہوا ہے ،یہیں سے یہ نکتہ بھی واضح ہو گیا کہ جو جائز ہو گا وہ سود نہیں ہو گا اور جو سود ہو گا وہ جائز نہیں ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے دونوں قسم کے فتاوے میں کامل ہم آہنگی و توافق پایا جاتا ہے اور ان میں کسی طرح کا تضاد یا تعارض نہیں، گویا امام احمد رضا دار الافتا کے مفتیوں کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ان سے کوئی دریافت کرے کہ ہندوؤں سے سود لینا جائز ہے یا ناجائز، بینکوں سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟ تو ان کے فتاویٰ کے الفاظ یہی ہونے چاہئیں کہ سود لینا کسی سے جائز نہیں ہے اگرچہ کافر حربی کا مال مباح ہونے کی وجہ سے سود کے زمرے میں داخل نہیں ہے۔

ان اہم نکات کی طرف چوں کہ عام طور پر لوگوں کا ذہن نہیں جاتا، اس لیے جب وہ امام کے فتوے کا مطالعہ کرتے ہیں تو خلجان ذہنی میں مبتلا ہو کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ ایک طرف تو یہ فتویٰ ہے کہ ہندوؤں اور غیر مسلموں کا مال مباح ہے، (بشرائط مذکورہ) اور دوسری جانب جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ سود لینا جائز ہے یا ناجائز؟ تو جواب یہ ملتا ہے کہ سود لینا کسی سے جائز نہیں ہے، حتیٰ کہ ہندوؤں سے بھی جائز نہیں ہے۔

حالاں کہ یہ سوچنا چاہئے تھا کہ جب لوگ براہ راست سود کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ لاتے ہیں تو کون سا فقیہ ہے جو یہ کہے گا کہ سود جائز ہے، ہر محتاط فقیہ برجستہ یہی ارشاد فرمائے گا کہ سود جائز نہیں ہے، اور اگر کبھی کسی کے کلام میں اس قسم کے الفاظ پائے جائیں کہ سود جائز ہے بشرطے کہ کافر حربی سے لیا جائے تو محض یہ تجوز ہوگا، جو نہ صرف احتیاط کے خلاف ہوگا بلکہ صحیح شرعی الفاظ کے استعمال کے خلاف ہوگا، پھر فاضل بریلوی جیسے عظیم المرتبت فقیہ فقید المثال سے یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کے قلم حقیقت رقم سے غیر قانونی الفاظ کا صدور ہوتا، وہاں تو تحقیقات کا انبار لگایا جاتا ہے، بڑے بڑے فقہا کی بارگاہ میں عجز و نیاز مندی کے باوجود ان کے تسامحات پر قلم کی جولانی دکھائی جاتی ہے، اس لیے ناممکن تھا کہ خود انہیں کے قلم سے اس قسم کا تسامح ظاہر ہوتا۔

اب ان فتاوے کی روشنی میں یہ بات عیاں ہو کر سامنے آگئی کہ ہندوستانی کافروں اور ان کے بینکوں میں روپیہ جمع کر کے زائد رقم ان کی رضا سے لینا بشرطے کہ کہ کسی معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو، جائز و مباح ہے۔

لیکن اس موقع پر یہ بات سب کو معلوم ہونی چاہئے کہ یہ صرف جواز و اباحت کا درجہ ہے، اس کا مطلب قطعًا یہ نہیں ہے کہ ایسی رقوم لے کر اپنے مصرف میں لانا افضل و مستحسن ہے، بلکہ بار بار فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ اپنے متعدّد فتاوے میں یہ تنبیہ کرتے ہیں کہ یہ مال لیا جائے، مگر اپنے ذاتی مصرف میں خرچ نہ کیا جائے، بلکہ اس کو غریبوں، یتیموں، بے کسوں، بے آسراؤں کے اوپر خرچ کرنا زیادہ بہتر ہے چناں چہ لکھتے ہیں:

سود لینا مطلقًا حرام ہے، مسلمان سے یا کافر سے، ہاں اگر ڈاک خانے میں یہ جمع کرے اور ڈاک خانہ جو کچھ اس پر زائد دے بلکہ یوں کہ ایک مال مباح برضائے مالک غیر مسلم بلا غدر ملتا ہے تو لے لینا جائز ہے، اور فقرائے مسلمین پر اس کا صرف کرنا اولیٰ ہے۔[مکتوبات امام احمد رضا خاں بریلوی ص ۲۵]

ایک دوسرے فتوے میں امام احمد رضا تحریر فرماتے ہیں کہ:

ایسا عقد شرعًا ضرور ناجائز ہے، لیکن اگر وہ مراؤ کافر ہے جیسا کہ یہی ظاہر ہے تو یہ روپیہ کہ بلا غدر اس کو ملا واپس دینا ضروری نہیں ہے، البتہ بہتر ہے کہ فقیر مسلمان پر تصدق کرے۔

[فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۱۲۳]

واضح ہو کہ یہ ایسے استفتا کے بارے میں فتویٰ دیا گیا تھا جس میں ایک مراؤ بلفظ دیگر ایک کافر سے زائد رقم لینے کا معاملہ کیا گیا تھا، اس پر دریافت کیا گیا تھا کہ یہ جائز ہے کہ ناجائز، اس جواب سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ مسلمان فقیر پر صدقہ کرنا افضل ہے۔

اس لیے ہر مفتی کو چاہئے کہ اگر وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی پیروی میں اس مسئلے میں جواز و اباحت کا فتویٰ دے تو ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دے کہ اس کا صدقہ کرنا بہتر و مستحسن ہے، نہ یہ کہ محض جواز کا فتویٰ دے کر استحسان کی جانب توجہ نہ دلائی جائے، کیوں کہ مسلمانوں کی بہت سی قومی ضرورتیں اس صورت میں پوری ہو سکتی ہیں، دینی مراکز، دعوت و تبلیغ کے ادارے، درس و نشر علوم کے مدارس، مسکینوں اور غربا کی کفالت میں اس سے اچھی خاصی مدد مل سکتی ہے، پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ حربی اور مسلم کے درمیان سود کا تحقق نہیں ہوتا، ائمۂ اسلام میں سے صرف امام اعظم اور ان کے نامور تلمیذ رشید

حضرت امام محمد رحمہا اللہ کا مسلک ہے، ان دونوں ائمہ کرام کے علاوہ قاضی القضاۃ للدولۃ العباسیہ، حضرت امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ ثلٰثہ یعنی امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنھم کا مذہب یہ ہے کہ حربی کافر اور مسلم کے درمیان سود کا تحقق ہوگا ،اس لیے اگر کوئی مسلمان کافر حربی سے زائد رقم لے تو ان ائمۂ اسلام کے نزدیک یہ ناجائز و حرام ہوگا، چناں چہ ابن قدامہ نے ائمۂ ثلٰثہ کے دلائل تفصیلاً بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن آیات کریمہ سے تحریم ربا کا ثبوت ملتا ہے وہ مطلق ہیں، ان میں مسلمان اور کافر کی کوئی قید نہیں ہے، اسی طرح ربٰو والی تمام حدیثیں عام ہیں، صرف ایک حدیث مرسل ایسی پائی جاتی ہے جس میں صراحت ہے کہ کافر حربی اور مومن کے درمیان ربٰو کا تحقق نہیں ہوتا، پھر فاضل مصنف ابن قدامہ اپنے قلم کی جولانی دکھاتے ہوئے حنفی مسلک کو اپنی تنقید کا نشانہ یوں بناتے ہیں:

لایجوز ترک ماورد بتحریمہٖ القراٰن و تظاھرت بہٖ السنۃ وانعقد الاجماع علیٰ تحریمہٖ بخبر مجھول لم یرد فی صحیح ولا مسند ولا کتاب موثوقٍ بہٖ و ھو مع ذلک مرسل محتمل و یحتمل ان المراد بقولہ لا ربٰوالنھی عن الربٰو کقولہ لا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج.

جس چیز کی تحریم قرآن حکیم سے ہوئی ہو، اور اس کی تائید احادیث کریمہ سے بھی ہوئی ہو، اور اس کی تحریم پر اجماع منعقد ہو گیا ہو، اس کو کسی مجہول کی خبر سے چھوڑا نہیں جاسکتا، جو کسی صحیح یا مسند یا کسی معتمد کتاب میں واقع نہیں ہوئی ہے، علاوہ ازیں یہ حدیث مرسل ہے جس میں احتمال پایا جاتا ہے اور وہ احتمال یہ ہے کہ سرکار کے قول: لاربٰوالخ سے مراد نفی نہیں بلکہ نہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: ولارفث الخ میں ہے۔ [المغنی ج٦ص٩٩، دارعالم الکتب العربیۃ، السعودیۃ]

ابن قدامہ کی تلخ و تند لہجے میں یہ تنقید اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب کہ حدیث مرسل مطلقاً قابل اعتماد نہ ہو اور ربا کے عدم تحقق کا مدار صرف یہی حدیث مرسل ہو، حالاں کہ واقعہ اس کے خلاف ہے، ربا کے عدم تحقق کی دلیل در حقیقت حربی کے مال کی اباحت ہے اور یہ اباحت متعدّد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے، اس لیے اس حقیر کے نزدیک ابن قدامہ کی یہ تنقید

قابلِ اعتنا نہیں ہے، تاہم چوں کہ ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک کافر حربی اور مسلم کے درمیان سود کا تحقق ہوتا ہے اس لیے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ جمیع ائمۂ مذاہب کے مسالک میں تطبیق ممکن ہے کہ نہیں ؟ اگر جمع و تطبیق کی کوئی امکانی صورت خواہ وہ کسی درجے میں ہو نکل آئے تو اس سے قطعاً صرف نظر نہیں کرنا چاہئے ، اس مسئلہ میں اس طرح سے تطبیق ممکن ہے کہ ایک حنفی یہ فتویٰ دے کہ کافر حربی سے زائد رقم لینا جائز ہے ، اور اس کی بھی وضاحت کردے کہ اس کا صدقہ کرنا افضل ہے ، کیوں کہ دوسرے ائمۂ مذاہب جب اس کو ناجائز بتاتے ہیں اور وہ بھی قرآن کریم اور احادیث کریمہ سے سند لاتے ہیں ۔ تو ان کے موقف سے بالکلیہ صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے ، بلکہ ایک لحاظ سے ان کے مذہب کی رعایت ضروری ہے ، چناں چہ در مختار میں ہے: ندب مراعاة الخلاف بالاجماع ۔ [در مختار ج ۱ کتاب الطہارۃ ص ۹۹]

فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں: مراعاۃ خلاف بالاجماع مستحب ہے ۔ [فتاویٰ رضویہ ج دوم ص ۳۶۸]

جیون بیمہ کا حکم:

عصر حاضر میں سودی کاروبار کے پھیلاؤ کے لیے سرمایہ پرستوں اور حکومتوں نے نئی نئی اسکیمیں تیار کیں بلکہ نئے نئے طریقے ایجاد کیے ان میں سب سے ہمہ گیر طریقہ بیمہ کمپنیوں کا قیام ہے ، یہ کمپنیاں اپنے اپنے دلالوں اور ایجنٹوں کو بہت اچھے انداز میں ٹریننگ دے کر بھیجتی ہیں ، یہ دلال انتہائی چرب زبان ، بڑے سخن فروش ، شیریں کلام ہوتے ہیں اور اپنی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ، ان کی سخن سازیوں کے جال میں بڑے سے بڑا دانش مند و دانش ور اور انتہائی دین دار و متقی و پرہیز گار پھنس جاتا ہے ، یہ مندروں کے پجاریوں و مہنتوں اور کلیساؤں کے راہبوں تک پہونچ جاتے ہیں ، ان کی رسائی مساجد کے اماموں اور خانقاہوں کے مشائخ تک ہوتی ہے ، یہ اپنی دل موہنی باتوں سے مملکت کے وزرا کو متاثر کرتے اور غریبوں کی جھونپڑیوں میں پہونچ کر ان بیچاروں کو بھی پھانس لیتے ہیں ، اور یہ ایسے انوکھے اور نرالے انداز میں اپنی کمپنی کی پالیسیوں کو بیان کرتے ہیں کہ سننے والا نہ صرف حیرت زدہ رہتا ہے بلکہ اس کو آہستہ آہستہ یقین ہوجاتا ہے کہ ہمارے اور ہمارے بچوں کے شاندار مستقبل کے لیے ان کے خزانے میں بہت سا سرمایہ

ہمارے انتظار میں تڑپ رہا ہے، بس ہم کو تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے۔

ہمارے ایک عزیز(جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے) کا یہ دلچسپ بیان نہایت سبق آموز بلکہ عبرت آموز ہے کہ بیمہ کمپنی کا ایک دلال میرے پاس آیا اور بڑی چرب زبانی سے پالیسیوں کے فوائد پر ایسی روشنی ڈالی کہ ہماری نگاہوں کے سامنے یہ منظر آیا کہ گویا ہماری تجوری میں لاکھوں روپئے کا ڈھیر جلد ہی پہونچنے والا ہے اور ہمارے بال بچوں کا شاندار مستقبل اس کی پالیسی لینے میں مضمر ہے، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ہزاروں انسانوں کی دولت سمیٹنے کے بعد بیمہ کمپنی والے اس کو سودی کاروبار میں خرچ کرتے ہیں، اور ایک آدھ آدمی کو انتہائی نازک صورت حال یا کسی حادثے کے پیش آنے پر فائدہ پہونچ جاتا ہے، اور اس کے لیے بھی کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس طرح لاٹری وغیرہ جوئے کی جدید شکل ہیں، ٹھیک اسی طرح بیمہ کا کاروبار بھی دولت کے سمیٹنے اور سودی کاروبار میں صرف کرنے کی ایک بدترین اسکیم ہے، اس میں جوا بھی ہے، اور سود بھی، اس میں کبھی دولت ضائع بھی ہوتی ہے، اور دوسروں کو سودی کاروبار پر ابھارا جاتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے تمام قواعد وضوابط کا جائزہ لیا جائے اور صرف اسی بات پر اعتماد نہ کیا جائے کہ بڑے نازک وقت پر اس سے فائدہ پہونچ جاتا ہے، کیوں کہ اس میں مال ضائع بھی ہوتا ہے۔

بیمہ کمپنیوں کی "ولادت منحوسہ" کا زمانہ بہت قدیم نہیں ہے، تاہم اس کا قیام انگریزوں کے عہد حکومت میں ہندوستان میں ہو گیا تھا، اور اس کی مختلف پالیسیوں کا رواج بھی تھا، لیکن آزاد ہند کے بعد جس تیزی کے ساتھ اس کا پھیلاؤ ہوا ہے، اس وقت نہیں ہوا تھا، اب گھر گھر، گاؤں گاؤں، بیمہ کمپنی کے دلال پہنچ رہے ہیں، اس لیے اس کی تنقیح ضروری ہے کہ جیون بیمہ کے جواز کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی خدمت مبارکہ میں متعدّد استفسارات اس کے بارے میں پیش ہوئے، اور بعض استفتا میں تفصیلاً اس کی مختلف صورتوں کا ذکر بھی کیا گیا، لیکن سوال کرنے والوں میں سے کچھ لوگوں نے سوال میں یہ ذکر کیا کہ ایسی بیمہ کمپنیوں

سے مسلمانوں کو فائدہ ہی پہونچتا ہے ،اور فائدہ بھی حتمی اور یقینی ہوتا ہے، مسلمانوں کے مال کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے، سوال کے اس طرح کے انداز پر فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے جیون بیمہ کو جائز قرار دیا۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماے دین کہ زندگی کا بیمہ کرانا شرعًا جائز ہے یا حرام، صورت اس کی یہ ہے کہ جو شخص بیمہ کرانا چاہتا ہے اس سے یہ قرار پایا جاتا ہے کہ پچپن سال یا ساٹھ سال یا پچاس سال کی عمر تک دو ہزار روپۓ چار روپۓ پایا پانچ روپۓ ماہوار کے اعتبار سے تنخواہ سے وضع ہوتے رہیں گے ،اگر وہ شخص پچپن سال تک زندہ رہا تو خود اس کو اور میعاد مقرر کے اندر مر گیا تو اس کے ورثا کو دو ہزار روپیہ یک مشت ملے گا، خواہ وہ بیمہ کرانے کے بعد اور اس کی منظوری آنے کے بعد فوراً ہی مر جائے اور اگر میعاد مقرر تک زندہ رہا تو بھی اس کو دو ہزار روپیہ ملے گا یہ بیمہ گورنمنٹ کی جانب سے ہو رہا ہے کسی کمپنی وغیرہ کو اس سے تعلق نہیں۔

اس سوال سے عیاں ہے کہ اس بیمہ سے کسی کو کوئی نقصان پہونچنے کا اندیشہ نہیں ہے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سراسر فائدہ ہی ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نظر نہیں آتی، ہاں بعض حالتوں میں یہ ضرور ہے کہ جمع کی ہوئی رقم سے زائد ملے گی یعنی تنخواہ سے جو رقم وضع ہوئی ہے ،اس وقت زائد ملے گی جب کہ میعاد سے پہلے اس کا انتقال ہو جائے مگر چوں کہ یہ حربی کا مال ہے اور حربی کا مال اس کی رضا سے لینا جائز ہے ،اس لیے اس رقم کے لینے میں کوئی قباحت شرعیہ نہیں پائی جاتی ،خلاصہ یہ ہے کہ اس سوال میں صرف یہ واضح ہے کہ مسلمان کا مال ضائع نہیں ہو گا اور اس میں فائدہ موہوم نہیں ہے ،بلکہ متیقن ہے اس لیے اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے حسب ذیل فتویٰ دیا۔

جواب: جب کہ یہ بیمہ صرف گورنمنٹ کرتی ہے اور اس میں اپنے نقصان کی کوئی صورت نہیں ہے، تو جائز ہے، کوئی حرج نہیں، مگر یہ شرط ہے کہ اس کے ذمہ کسی خلاف شرع احتیاط کی پابندی عائد نہ ہوتی ہو، جیسے روزہ و حج کی ممانعت ۔واللہ تعالیٰ اعلم۔[احکام شریعت ج۳ص۴۸۔۴۹،نظامیہ کتاب گھر لاہور]

اس فتوے کے پیش نظر ہماری جماعت کے بعض مفتیان کرام نے جیون بیمہ کے

جواز کا فتویٰ دیا۔

سوال: دیوبند کے مفتی نے جواب دیا ہے کہ زندگی کا بیمہ کرانا جائز نہیں کہ رِبٰو یعنی سود و قمار ہے، کیا مفتی مذکور کا جواب صحیح ہے؟

جواب: اگر یہ بیمہ کمپنیاں خاص کفار کی ہوں تو بیمہ کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ مسلمان کا نقصان نہ ہو اور اس کو رِبٰو و قمار قرار دے کر حرام کہنا صحیح نہیں ہے۔[بیمہ وڈاکخانے کے منافع کا شرعی حکم ص۲۱]

اس فتوے میں بھی خاص طور پر بیمہ کے جواز کا حکم دیا گیا ہے اس سے ثابت ہوا کہ ہر ایسا بیمہ جس میں مسلمان کے مال کے نقصان کا اندیشہ ہو یا اس کے مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو یا فائدہ بالکل موہوم و خیالی ہو تو ایسا بیمہ کروانا جائز نہیں ہے، چناں چہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کے پاس درج ذیل مفصل استفسار ہوا:

سوال: ایک بیمہ کمپنی جس کے مالک و مختار سب کے سب نصرانی المذہب ہیں علاوہ دریا و آگ کے بیمے کے جان کا بھی بیمہ ہوتا ہے اس کی صورتیں متفرق ہیں:

۱۔ پہلی صورت: میں تمام عمر ایک مقررہ بیمہ اتارنے والا کمپنی مذکور کو ہر سال دیتا رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو بیمہ کی رقم دی جاتی ہے، مثلاً تیس سال کی عمر کے شخص نے ہزار روپئے کی رقم کے لیے اپنا بیمہ اتارا تو سالانہ فیس اس کو اٹھائیس ہزار روپیہ دینا پڑے گا اور اس کے مرنے کے بعد کمپنی اس کے وارثوں کو پورا ایک ہزار روپیہ دے دے گی، مثلاً آج کوئی (کسی) شخص نے بیمہ کمپنی سے معاہدہ کیا اور پہلے سال کی فیس دے دی اس کے بعد دو مہینہ یا دو سال یا چار سال کے بعد مر گیا تو بیمہ کی پوری رقم ایک ہزار روپئے اس کے وارثوں کو مل جائے گی۔

سوال کے اس حصے میں صراحت نہیں ہے کہ اگر دو چار قسطوں کی ادائگی کے بعد یا آدھی رقم کی ادائگی کے بعد سالانہ فیس ادا نہ کر سکا تو اس کی رقم سوخت ہوگی یا نہیں لیکن عام طور پر بیمہ کا کاروبار اسی طرح چلتا ہے کہ بہت سے لوگوں کی رقمیں کچھ دنوں کے بعد عدم ادائگی کی وجہ سے سوخت ہو جاتی ہیں اس لیے اس صورت میں اتنی بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ اگر

پالیسی لینے والا زندہ رہا اور چند قسطوں کی ادائگی کے بعد بقیہ قسطیں ادا نہیں ہو پائیں تو اس کی پوری یا نصف رقم سوخت ہو جائے گی جیسا کہ آگے اس کی صراحت آرہی ہے، کیوں کہ مدت نہایت طویل ہے اس لیے ادائگی کے موانع زیادہ ہو سکتے ہیں۔

۲۔ دوسری صورت: یہ ہے کہ معدودنی (فیس) فقط چند سال تک ہر سال کمپنی مذکور کو دیتا رہا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو اس بیمہ کی پوری رقم ایک ہزار دے دی جائے گی، یہ پہلی صورت سے اچھی ہے، چند سال فی بھرنے کے بعد بھرنا نہیں ہوتا، مثلاً ایک شخص کی عمر تیس سال ہے اور سات سال تک کمپنی مذکور کو ساڑھے تیس روپیہ فیس دیتا رہے اور پھر نہ دے تو اس کے وارثوں کو بعد موت بیمہ کی رقم دے دی جائے گی اور اگر بیمہ اتارنے والا قبل مدت مر گیا تو بھی اس کے وارثوں کو ایک ہزار رقم دے دی جائے گی۔

پہلی صورت اور دوسری صورت میں فرق صرف یہ ہے کہ پہلی شکل میں زندگی بھر فیس ادا کرنی پڑے گی اور اس دوسری صورت میں ایک متعیّنہ مدت تک فیس دینی پڑے گی، لیکن اس میں بھی قبل مدت معینہ اگر فیس کی ادائگی کسی وقت نہ ہو پائی تو نصف جمع شدہ رقم سوخت ہو جائے گی، اس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ شرط لگائی جارہی ہے یعنی جوا کھیلا جارہا ہے، اگر بازی جیت گئے تو فائدہ ہی فائدہ ہے ورنہ نصف مال ضائع ہو جائے گا، بہر حال ان دونوں صورتوں میں قمار نہ ہونے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ تیسری صورت: کوئی شخص جو بیمہ اتارتا ہے مثلاً پچپن سال یا ساٹھ سال کی عمر کو پہونچنے کے بعد بیمہ کی ہوئی رقم کو وصول کرنا چاہتا ہے، اس عمر تک بیمہ اتارنے والا زندہ رہا تو رقم مذکور اس کو ملے گی، ہر بڑھاپے عمر کی فیس جدا ہے، مثلاً تیس سال کی عمر کا شخص ساٹھ سال کی عمر کو پہونچنے کے بعد ایک ہزار چاہتا ہے تو سالانہ اس کو فیس مذکور دینا پڑے گا اور اس کو ساٹھ سال کی عمر میں بیمہ کی رقم ایک ہزار ملے گی، اس درمیان میں بیمہ اتارنے والا مر گیا تو پوری رقم بیمہ کی ایک ہزار اس کے وارثوں کو مل جائے گی۔

اس صورت میں بھی یہ صراحت نہیں پائی جاتی کہ (مثلاً) اگر پندرہ سال تک بیمہ اتارنے والے نے چونتیس روپئے سالانہ فیس ادا کیے اور اس کے بعد فیس نہ ادا کر سکا تو پھر اس کی رقم کا کیا حال ہوگا، ایا پندرہ سال کی جمع شدہ رقم واپس ملے گی یا نہیں، لیکن صراحت

آرہی ہے کہ اگر بیمہ اتارنے والا اپنی حیات میں سالانہ فیس ادا کرنے سے مجبور ہو گیا تو نصف جمع شدہ رقم سوخت ہو جائے گی، اس صورت میں بھی مال کے ضائع ہونے کا شدید خطرہ موجود رہتا ہے، اس لیے کہ اس طویل میعاد میں ادئگی کے بہت سے موانع پیدا ہو سکتے ہیں۔

۴۔ چوتھی صورت: یہ صورت تیسری صورت سے ملتی جلتی ہے، فرق یہ ہے کہ اس صورت میں بیمہ اتارنے والے کو صرف تیس سال تک فیس دینی پڑتی ہے، اس کی فیس تیسری صورت سے ذرا زیادہ ہے، مثلاً تیس سال کی عمر کا شخص ساٹھ سال میں ایک ہزار روپیہ چاہتا ہے تو اس کو سالانہ فیس بیالیس روپیہ دینا ہو گا، بیس سال کے بعد پھر نہ دینا ہو گا، جب وہ ساٹھ سال کی عمر میں پہنچے گا تو کمپنی اس کو بیمے کی رقم دے دے گی یعنی مبلغ ہزار روپے، اس اثنا میں وہ مر گیا تو اس کے وارثوں کو پوری رقم ایک ہزار روپے مل جائے گی۔

تیسری اور چوتھی صورت میں فرق صرف اتنا سا ہے کہ وہاں مسلسل تیس سال تک بیمے کی رقم ادا کرنی پڑے گی پھر ساٹھ سال کی عمر کے بعد ادائگی نہیں ہوگی اور چوتھی صورت میں اگرچہ بیمہ ساٹھ سال کا ہے تاہم ادائگی پچاس سال تک رہے گی یعنی صرف بیس سال تک ادا کرنی پڑے گی، پھر اس کو دس سال تک کچھ نہیں دینا ہو گا، لیکن یہاں فیس کی رقم نسبتاً زیادہ ہے۔

سائل نے یہاں تک بیمے کی تمام صورتوں کو ذکر کرنے کے بعد یہ صراحت کی ہے کہ:

کوئی شخص مذکورہ بالا صورتوں کا بیمہ لینے کے بعد چند سال بیمے کی فیس دیتا رہا، اس کے بعد نہ دینا چاہے یا نہ دے سکا اور کمپنی سے روپے جو بھرا ہے واپس چاہے تو نصف رقم ادا کردہ کی اس کو ملے گی، مثلاً دس سال تک دیتا رہا، اندازاً جملہ چار سو ہوا یا زیادہ ہوا یا کم ہوا، اب وہ کمپنی سے اپنا معاہدہ منسوخ کرا کر جو روپے بھرا ہے واپس چاہتا ہے تو فقط نصف رقم چار سو کی دو سو ملے گی اور اگر وہ واپس نہیں چاہتا تو مدت مقررہ کے گزرنے پر جس کا وہ انتخاب کیا ہو بوقت معاہدہ بیمے کی رقم یا مناسبت ملے گی، مثلاً چوتھی صورت کا بیمہ لیا، پانچ سال تک فیس دیتا رہا اس کے بعد نہ دے سکا یا نہ دینا چاہا تو اس کو پاؤ رقم کی رسید ملے گی، یعنی دو سو پچاس روپے اس کو یا تو بشرط حیات ساٹھ سال کی عمر میں مذکورہ روپیہ دو سو پچاس ملے گا یا بعد موت اس کے وارثوں کو ملے گا یا بعد موت اس کے وارثوں کو ملے گا۔

بیمے کی فیس جدا جدا ہے، جتنی کم عمر ہوگی اتنی ہی فیس کم ہوگی، یہ حساب بیمہ اتارتے وقت کیا جاتا ہے اور بیمہ اتارنے کے وقت جو عمر رہتی ہے تمام عمر بڑھاپے کی عمر تک بھرنا ہوگا۔

مذکورہ بالا صورتوں سے روپیہ جمع کرنا اور بیمہ کمپنی سے معاہدہ کرنا اور کمپنی مذکور سے وصولی کرنا شرعًا جائز ہے یا نہیں، سائل حنفی المذہب ہے، لہٰذا فتویٰ بھی اسی مذہب پر ہو۔

والسلام

سائل نے جیون بیمہ کی جو چار صورتیں ذکر کی ہیں ان میں سے کوئی ایک صورت نہیں ہے جس میں یہ ضمانت موجود ہو کہ بیمہ کروانے والے کی تمام رقم ہر حالت میں محفوظ رہے گی بلکہ عدم ادائگی فیس کی حالت میں نصف رقم ضرور ڈوب جائے گی اور اگر میعاد تک اس رقم کو وصول نہ کرنے کا ارادہ کر لیا تو ضرور اس کو پوری رقم ملے گی، غور فرمائیے کہ بیمہ کمپنی میں پیسہ جمع کرنے کے بعد آپ کتنے بے دست و پا ہو جاتے ہیں کہ اپنی مجبوریوں اور موانع کی بنا پر اپنی پالیسی کو جاری نہ رکھ سکیں تو ایسی شکل میں آپ کو دو ہی راستے رہ جاتے ہیں: ایک یہ کہ نصف رقم واپس لے کر باقی نصف کے لیے کف افسوس ملتے رہیں اور دوسرے یہ کہ اپنی دوا علاج کے لیے ضرورت تو آج آپ کو ہے لیکن پندرہ سال کے بعد پوری رقم آپ کو ملے گی، کتنی قباحتیں، کتنے مفاسد اس میں پائے جاتے ہیں کہ اگر فکر کی جائے تو اول نظر میں یہی فتویٰ ہونا چاہئے کہ یہ سب ناجائز و حرام ہے لیکن سطحی نگاہ رکھنے والی شخصیت نہیں بلکہ ایسی بلند پایہ ذات بابرکات جس نگاہِ خوردبین سے فقہ کا کوئی دقیق سے دقیق جزئیہ یا باریک سے باریک نکتہ پوشیدہ نہیں ہے، اس لیے اسلامی قانون کے عظیم ماہران سب صورتوں میں بیمہ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے سائل کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

جواب: یہ بالکل قمار ہے اور محض باطل کہ کسی عقد شرعی کے تحت میں داخل نہیں، ایسی جگہ عقود فاسدہ بغیر عذر کے جو اجازت دی گئی وہ اس صورت سے مقید ہے کہ ہر طرح ہی اپنا نفع ہو اور یہ ایسی کمپنیوں میں کسی طرح متوقع نہیں لہٰذا اجازت نہیں۔ کما حقق المحقق علی الاطلاق فی فتح القدیر و اللہ تعالیٰ اعلم۔ [فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۱۱۲۔ ۱۱۳ مکتبہ رضویہ کراچی]

خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ کمپنیوں میں جیون بیمہ کروانا اسی وقت درست ہو گا جب قطعی طور سے یقین ہو جائے کہ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور مال کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس شکل میں زندگی کا بیمہ کروانا ناجائز ہے، کیوں کہ یہ نرا قمار ہے جو عقد فاسد ہے اور عقد فاسد کے ذریعے اسی وقت حربی کا مال لیا جاسکتا ہے جب کہ مال کے ضائع کا اندیشہ نہ ہو، ایک بات یہاں البتہ واضح ہے کہ بھارتی حکومت کے ملازمین اپنی تنخواہوں کو وضع کر کے جو بیمہ کراتے ہیں اس میں کسی طرح سے مسلمان ملازم کو نقصان کا اندیشہ نہیں، یہ بیمہ شرعًا جائز و مباح ہے، جیسا کہ فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے اپنے فتوے میں اس کو کھول کر بیان کیا ہے.

باب پنجم

فقہ اسلامی کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے معاملاتِ خرید وفروخت ہیں جن میں بظاہر سود نظر نہیں آتا لیکن گہرائی میں اترنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی کسی نہ کسی حیثیت سے سود کی نحوست ضرور پائی جاتی ہے، غالبًا اسی وجہ سے علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہر بیع حرام پر ربٰو کا اطلاق ہوتا ہے، نیز فقہاے حنفیہ بھی تصریح فرماتے ہیں کہ سود کے دائرے میں تمام بیوعِ فاسدہ بھی داخل ہیں، لیکن علامہ شامی اس کلیہ کو بجا طور پر تسلیم کرتے اور فرماتے ہیں:

والاصل فيه كل ما كان مبادلة مالٍ بمال يبطل بالشروط الفاسدة لان الشروط الفاسدة من باب الربٰوا۔

اس بارے میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جس میں مال کا مبادلہ مال سے ہو فاسد شرطوں سے باطل ہوجائے گا کیوں کہ شروط فاسدہ ربٰو کے زمرے سے ہیں۔ [ردالمحتار ۴ ص ۱۰۱]

اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے معاملاتِ خرید وفروخت میں سود نہیں ہوتا ہے اگر چہ وہ باطل یا فاسد ہوں تاہم جس معاملہ میں شرطِ فاسد ہو اس میں ضرور سود کا تحقق ہوگا، اس لیے اس باب میں بیوعِ فاسدہ کے چند مسائل اور ضمناً عقودِ فاسدہ کے احکام ذکر کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ بیوع فاسدہ کے چند مسائل:

☆ اس زمانے میں کاشت کار اپنی ان پیداوار کو جو زیر زمیں ہوتی ہیں کبھی فروخت کردیتا ہے، جیسے مولی، گاجر، آلو، مونگ پھلی جو زمین کے اندر مستور ہوتی ہیں ان کو بیچ دیتا ہے اور یہ پہلے سے پتہ لگا لیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں موجود ہیں، ان کی خرید وفروخت جائز ہے، البتہ خریدار کو زمین سے برآمد ہونے کے بعد لینے نہ لینے کا اختیار ہوگا، لیکن اگر اب تک ان چیزوں کا پتہ نہ لگایا گیا کہ موجود ہیں یا معدوم، یعنی پیدا ہوئی ہیں یا نہیں، ان کو بیچ دیا گیا تو یہ بیع باطل ہے۔ [الدرالمختار مع ردالمحتار ج ۷ ص ۲۳، دار عالم الکتب السعودیہ]

☆ مادۂ تولید (یعنی نطفہ خواہ انسان کا ہو یا دیگر حیوانات کا) کی خرید و فروخت قطعاً باطل ہے، یہ حکم فقہ اسلامی کے اس جزئیہ سے مستفاد ہے کہ جانور کی پشت میں یا مادہ کے پیٹ میں جو نطفہ ہوتا ہے اس کی بیع باطل ہے اور اس زمانے میں ٹیوب یا نلکی سے بچہ پیدا کرنے کے لیے مادۂ تولید کو قیمتاً لیا جاتا ہے یہ ناجائز و حرام ہے اور مصنوعی ذرائع سے بچہ کی پیدائش کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کے حرام ہونے میں بھی کلام نہیں کیا جاسکتا۔[مرجع سابق، ص۲۳۸]

☆ مسجد کی خرید و فروخت ناجائز و حرام ہے، یہاں تک کہ اگر مسجد کے ساتھ دوسری چیز ملا کر بیع کی جائے تو نہ صرف مسجد کی بیع باطل ہوگی بلکہ دوسری چیز کی بھی بیع باطل ہو جائے گی، حالاں کہ اگر غیر وقفی چیز کو وقفی چیز کے ساتھ ملا کر بیچا جائے تو اس کی بیع ہو جائے گی، اس جزئیہ سے مسجد مستثنیٰ ہے۔[البحر الرائق ج۶ ص۹۰، ردالمحتار ج۷ ص۲۴۴، مطبع سابق]

☆ اگر کوئی شخص اس امید پر کسی چیز کو بیچ ڈالے کہ میں اس کو خرید لوں گا یا ہبہ یا میراث یا کسی اور ذریعے سے یہ چیز مجھے مل جائے گی جیسا کہ آج کل کے تاجر کرتے ہیں تو ایسی بیع ناجائز ہے، ہاں اگر بیع سلم کی جائے تو اس کی شرائط متعیّنہ کے ساتھ ضرور جائز ہے۔[ردالمحتار ج۷ ص۲۴۶، دار عالم الکتب، السعودیہ]

☆ انسان کے بال کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے، نہ ہی اس کو کسی کام میں لایا جاسکتا ہے، اگر عورتیں اس کی چوٹیاں بنا کر استعمال کریں تو حرام ہے، کیوں کہ حضور ﷺ نے حدیث پاک میں اس پر لعنت فرمائی ہے۔

اس مسئلے کے ذکر کرنے کے بعد علامہ شامی فرماتے ہیں۔

لو اخذ شعرالنبی ﷺ ممن عنده واعطاه هديةً عظيمةً لا علىٰ وجه البيع فلا باس به۔(ردالمحتار، ج ۷ ص ۲۴۵ ،مطبع سابق)

حضور ﷺ کے موے مبارک کو جس کے پاس ہوں اس سے کوئی دوسرا شخص لے لے اور اس کو کوئی بڑا تحفہ پیش کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جب کہ بیع و شرا کا معاملہ نہ ہو۔

اور موے مبارک سے برکت حاصل کرنا اور اس کا غسالہ پینا اور آنکھوں پر ملنا بغرض شفا مریض کو پلانا درست ہے۔[بہار شریعت یازدہم ص۲۰۰، مکتبۃ المدینہ کراچی]

☆ اگر دو شخص کسی مکان میں شریک ہوں تو ان میں سے کوئی بھی اس مکان کے کسی متعیّن جز کو نہیں بیچ سکتا، اگر اس کو بیچے گا تو اس کی بیع درست نہ ہوگی، البتہ اپنا پورا حصہ بیچ سکتا ہے۔ [عالمگیری و بہار شریعت یازدہم ص ۷۰۰ مکتبۃ المدینۃ کراچی]

☆ اگر خرید و فروخت میں قیمت کا تذکرہ نہ ہو بلکہ یہ کہا گیا ہو کہ بازار میں اس کا جو نرخ (بھاؤ) ہے وہی قیمت دے دینا تو یہ بیع فاسد ہوگی۔ [الدر المختار ج ۴ ص ۱۰۶]

☆ مچھلیاں دریا یا تالاب میں ہوں اور ابھی تک ان کا شکار نہ کیا گیا ہو، اگر ان کو روپئے پیسے سے بیچا گیا تو یہ بیع باطل ہے، اگر ان کو کپڑا یا کسی اور چیز کے بدلے بیچا گیا تو بیع فاسد ہے، یعنی دونوں صورتوں میں یہ بیع ناجائز ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دوسری صورت میں قبضہ کے بعد مالک ہوجائے گا۔ [الدر المختار، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، ص ۴۱۴، دار الکتب العلمیہ بیروت]

☆ اگر مچھلی کا شکار کرنے کے بعد کسی گڑھے میں ڈال دیا گیا اور وہ گڑھا ایسا ہے کہ بغیر کسی تدبیر کے اس سے مچھلیوں کو پکڑا جاسکتا ہے تو بیع جائز ہے اور اگر اسے پکڑنے کے لیے شکار کرنے کی ضرورت ہو یعنی جال وغیرہ ڈالنے کی تو اس کی بیع ناجائز ہے۔ [ایضا]

☆ تالابوں یا جھیلوں کو مچھلیوں کے شکار کے لیے ٹھیکہ پر دینا جیسا کہ آج کل اس کا رواج ہے ناجائز ہے۔ [بہار شریعت، حصہ یازدہم، ص ۷۰۹، مکتبۃ المدینہ]

☆ مردار کی چربی کو بیچنا یا اس سے کسی قسم کا نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، نہ اسے چراغ میں جلایا جاسکتا ہے نہ چمڑا پکانے کے کام میں لایا جاسکتا ہے، جابر بن عبداللہ سے مروی ہے:

عن جابر بن عبد الله -رضي الله عنهما- أنه سمع رسول الله -صلى الله عليه وسلم- يقول عام الفتح وهو بمكة: «إن الله ورسوله حرم بيع الخمر والميتة والخِنزير والأصنام»، فقيل: يا رسول الله أرأيت شحوم الميتة، فإنه يُطلى بها السفن، ويُدهن بها الجلود، ويَستصبِح بها الناس؟ قال: «لا، هو حرام» ، ثم قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-عند ذلك: «قاتل الله اليهود، إن الله حرم عليهم الشحوم، فأَجْمَلوه، ثم باعوه، فأكلوا ثمنه».

ترجمہ: انھوں نے فتح مکہ کے سال سرکار کو فرماتے ہوئے سنا (اور آپ مکہ مکرمہ میں تھے)

بے شک اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، سور، بت کی خرید و فروخت کو حرام کیا، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ !آپ مردار کی چربی کے بارے میں بتلائیں کہ اس سے کشتیوں میں لیپ دیا جاتا ہے اور چمڑوں کی دباغت میں لگایا جاتا ہے اور لوگ اسے چراغ میں بھی جلاتے ہیں ؟آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ناجائز و حرام ہے، اس کے بعد سرکار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کے اوپر لعنت کرے کہ اللہ نے ان کے اوپر چربیوں کو حرام کیا تھا تو انہوں نے اس کو پگھلایا پھر بیچا پھر اس کی قیمت اپنے مصرف میں لائے۔[صحیح البخاری ج ا ص ۲۹۸، کتاب البیوع]

انتباہ !اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ مردار کی چربی سے کسی طرح کا فائدہ نہیں حاصل کیا جا سکتا، اس لیے غیر مسلم ملکوں سے جو صابن وغیرہ (مصنوعات) درآمد کیے جاتے ہیں جن کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ اس میں چربی ملی ہوئی ہوتی ہے انہیں استعمال نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس حدیث پاک کے پیش نظر کافر کے کارخانہ میں بنے ہوئے صابن وغیرہ سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔

☆ درختوں پر جو پھل لگے ہوئے ہوں اور وہ ابھی تک نمایاں نہ ہوئے ہوں ان کی بیع مطلقاً باطل ہے اور اگر پھل نمایاں ہو گئے ہوں، خواہ قابل انتفاع ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں تو ان کی بیع جائز ہے جب کہ اس شرط کے ساتھ نہ خریدے گئے ہوں کہ تیار ہونے تک انہیں پر باقی رہیں گے اور اگر درختوں پر چھوڑ دینے کی شرط کے ساتھ خریدے گئے ہوں تو ان کی بیع فاسد ہے۔[عالمگیری ج ۳ ص ۱۱۴، دار الکتب العلمیۃ بیروت]

☆ خون کی بیع و شرا ناجائز و حرام ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۷۳، پ ۲)

ترجمہ: اس نے یہی تم پر حرام کیے ہیں (یعنی) مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کے نام لے کر ذبح کیا گیا، تو جو ناچار ہو نہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

عصر جدید میں خون کی خرید و فروخت جاری ہے حتیٰ کہ بلڈ بینک (Blood

Bank) قائم ہیں اور بہت سے مریضوں اور زخمیوں کو خون چڑھایا جاتا ہے اس لیے ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ قرآن حکیم کے بموجب خون کے استعمال سے قطعًا احتراز کرے لیکن موجودہ عہد میں جان کی حفاظت اور انسان کو ہلاکت سے بچانے کے لیے خون کے استعمال کو لازمی قرار دیتے ہیں یعنی جب خون نہ چڑھایا جائے تو ڈاکٹر فیصلہ کرتے ہیں کہ ایسا مریض جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اس لیے ایسی اضطراری حالت میں خون کا استعمال جائز ہوگا اور اسی پر یہ مرتب ہوگا کہ اس کا خریدنا بھی محض حفاظتِ جان کے لیے مباح ہوگا، اسی لیے قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ جو شخص مجبور ہو جائے اور خواہش سے وہ نہ کھائے اور نہ ہی ضرورت سے آگے بڑھے تو اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ حالتِ اضطرار میں خون کا خریدنا اور اس کا استعمال مباح ہوگا۔

۲۔ لاٹری کی حرمت کا بیان:

عہد جدید میں جوا اور قمار کی نئی شکلیں ایجاد کی گئیں، جن کی ظاہری ہیئت وصورت کے بدل جانے سے ان کی حرمت میں کلام نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ قرآن حکیم میں "قمار" کی حرمت کا بیان علی الاطلاق ہوا ہے کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (المائدۃ: ۹۰)

اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک ہی ہیں، شیطانی کام، تو ان سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس سے ثابت ہوا کہ جوا اور وہ تمام ذرائع جن سے لوگوں کا مال محفوظ محض بخت واتفاق سے حاصل ہو قطعًا حرام ہیں، اور انہیں میں اس زمانے کی لاٹری بھی داخل ہے جس کا کاروبار حکومتوں کی طرف سے بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے، لاکھوں روپئے کے ٹکٹ خریدے جاتے ہیں، اور سیکڑوں ایجنٹ اس کام پر مامور ہوتے ہیں، محض اتفاق سے جب کسی کے نام کا نمبر نکل آتا ہے تو وہ بڑا خوش نصیب اور نصیبہ ور شمار کیا جاتا ہے کہ وہ کسی محنت ومشقت کے بغیر آن واحد میں لکھ پتی بن جاتا ہے۔

استاذ کریم حضرت بحر العلوم مفتی عبدالمنان صاحب مد ظلہ العالی نے اس کی تاریخ

بیان کرتے ہوئے بڑی دقت نظر سے اپنے ایک فتوے میں اس کی حرمت پر دلیل پیش کی ہے، اور بڑی جان دار بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

"اور آج کل اس میں نئی تراش خراش جاری ہے، اور بھانت بھانت کی ہار جیت ہوتی ہے جس کو سب لوگ بالاتفاق جوا سمجھتے ہیں، اور جو حقیقۃً جوا اور قمار ہی ہے (کیوں کہ اس کے اوپر جوا کی تعریف صادق آتی ہے)۔

القمار کل لعب یشترط فیه ان یاخذ الغالب من المغلوب شیئاً سواء کان بورق اوغیره ۔(المنجد ص 837)

جوا ہر وہ کھیل ہے جس میں یہ شرط لگائی گئی ہو کہ جیتنے والا ہارنے والے سے کچھ لے گا خواہ ہار جیت پتوں کے ذریعے ہو یا کسی اور ذریعے۔

اور شرع میں بھی جوے کی حقیقت یہی ہے، شامی میں ہے:

القمار من القمر الذی یزید و ینقص و سمی القمار قماراً لان کل واحد من المقامرین ممن یجوز ان یذهب ماله الیٰ صاحبه و یجوز ان یستفید مال صاحبهٖ (رد المحتار،ج ۵ ص ۵۷۷ ،دار عالم الکتب ،السعودیه)

"قمار" کا لفظ قمر سے بنا ہے جو کہ گھٹتا بڑھتا ہے، اور جوا کا نام اس لیے جوا رکھا گیا ہے کہ جوا کھیلنے والوں میں سے ہر ایک آدمی کے مال میں ہر دم گھٹنے بڑھنے کا امکان رہتا ہے کہ اس کا مال اس کے مقابل کو مل جائے اور دوسرے کا اس کی طرف چلا آئے۔

اس لیے ہر وہ معاملہ جس میں ہار جیت ہو اور جیتنے والے کو ہارنے والا تاوان ادا کرے "قمار" ہے، جو ناجائز و حرام ہے، تفسیر روح المعانی میں ہے:

و فی حکم ذلک جمیع انواع القمار من النرد و الشطرنج وغیرهما حتی ادخلوا فیه لعب الصبیان بالجوز والکعاب والقرعة من غیر القسمة و جمیع المخاطرة والرهان و عن ابن سیرین کل شئی فیه خطر فهو المیسر ۔(تفسیر روح المعانی ج ۱ ص۵۰۸،دارالکتب العلمیة بیروت)

اس حکم میں جوے کی تمام قسمیں ہیں، نرد اور شطرنج نیزان کے علاوہ یہاں تک کہ علما نے اس میں اخروٹ اور مہروں سے بچوں کے کھیل اور تقسیم کے بغیر قرعہ اندازی اور ہر قسم کی ہار، جیت والی بازیاں اور شرطیں شامل کی ہیں، ابن سیرین نے فرمایا کہ جس میں شرط ہو، وہ جوا ہے۔

آج کل کی مروجہ لاٹری کے جوا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اس میں ایک طرح سے ہار جیت کی شرط لگی رہتی ہے، لیکن علامہ آلوسی نے ”القرعة من غير القسمة “کہہ کر خاص طور سے لاٹری ہی کا نام لے لیا کہ مال بہت سے لوگوں نے مل کر دیا، اور یہ شرط لگائی کہ قرعہ ڈالا جائے پھر جس کا نام یا جن لوگوں کا نام نکل آئے وہ پورا مال یا اس کا متعیّن حصہ لے لے، اس لیے اس کے شرعًا جوا اور حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں ٹکٹ کے پیسے کے ضائع ہونے کا امکان یا لاکھوں کے فائدے کا امکان ہے (جو محض اتفاق سے ہی ہوگا) یہی جوے کی حقیقت اور روح ہے۔

۳۔ رشوت:

رشوت ہندوستانی سماج و معاشرے کی ایسی لعنت یا بیماری ہے جس کے خاتمے کے لیے حکومت کے قوانین اور اس کے تعزیرات ناکافی نظر آتے ہیں، جہاں دیکھو اس ”دیو پَری پیکر" کا جلوہ نظر آتا ہے، کوئی ایسا ایوان حکومت یا کچہری اور دفتر نہیں ہے جہاں کے ذمہ دار افسران اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اور رشوتوں سے اپنے "حقوق" کے طالب نہ ہوتے ہوں، یہ ہندوستانی عوام کے انصاف کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس سے نہ جانے کتنے لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے، اور کتنے لوگ ناکام و نامراد ہوتے ہیں اس لعنت میں ایسے لوگ گرفتار ہیں جن کے ذمے نظم و انتظام اور عدل و انصاف کا کام سپرد کیا گیا ہے، اور اس کے جواز کے لیے مختلف قسم کے بہانے تراش لیے جاتے ہیں، بعض لوگ اس کو اپنا واجبی حق تصور کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اس کی حرمت کا بیان بڑے بلیغ اور مؤثر اسلوب میں ہوا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوٰلَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبٰطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوٰلِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ: ۱۸۸، پ ۲)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لیے پہونچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر جان بوجھ کر کھاؤ۔

اپنی جماعت کے مشہور مفسر قرآن حضرت صدرالافاضل علیہ الرحمۃ والرضوان اس آیت کے تفسیری حاشیے میں رقم طراز ہیں کہ:

اس آیت میں ہر باطل طور پر کسی کا مال کھانا حرام فرمایا گیا خواہ لوٹ کر یا چھین کر یا چوری سے یا جوے سے یا حرام تماشوں اور حرام کاموں یا حرام چیزوں کے بدلے یا رشوت یا جھوٹی گواہی سے ہو یہ سب ممنوع و حرام ہیں، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ناجائز فائدے کے لیے کسی پر مقدمہ بنانا اور اس کو حکام تک لے جانا ناجائز و حرام ہے، اسی طرح اپنے فائدے کی غرض سے دوسرے کو ضرر پہنچانے کے لیے حکام پر اثر ڈالنا، رشوتیں دینا حرام ہے، جو حکام رس لوگ ہیں وہ اس آیت کو پیش نظر رکھیں، حدیث شریف میں مسلمانوں کے ضرر پہنچانے والے پر لعنت آئی ہے۔ [خزائن العرفان]

حضور ﷺ نے حدیث شریف میں رشوت خوروں اور رشوت دینے والوں دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

عن عبداللہ بن عمرو قال: لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی۔ [سنن ابوداؤد، کتاب الاقضیۃ، باب فی کراھیۃ الرشوۃ، ص ۶۷۳، مشکوۃ ج ا ص ۳۲۶، مجلس برکات مبارک پور]

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور ﷺ نے رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت فرمائی۔

رشوت تو بڑی بات ہے کسی کے جائز حق کی سفارش پر اگر کوئی شخص ہدیہ قبول کرے تو اس کو بھی حضور ﷺ نے نہ صرف ناجائز بتایا بلکہ سود کا بڑا دروازہ بتایا، چناں چہ ابو امام باہلی سے مروی ہے کہ:

قال من شفع لاحد شفاعۃ فاھدی لہ ھدیۃ علیھا فقبلھا فقد اتی بابا عظیما من ابواب الربٰو ،رواہ ابو داؤد ۔ [سنن ابوداؤد، کتاب الاجارہ، باب فی الھدیۃ لقضاء

الحاجۃ، ص ٦٦٦، دار الفکر بیروت]

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کی سفارش کی، دوسرے نے اس کو تحفہ پیش کیا، اس نے اس کو لے لیا، تو بلا شبہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں وہ داخل ہو گیا۔

اس لیے حضور ﷺ نے رشوت کے دروازے کو بند کرنے کے لیے ایسے تمام ہدایا و تحائف کو حکام کے لیے ناجائز قرار دیا جو ان کے عہدے کی بنا پر پیش کیے جاتے ہیں، بالفاظ دیگر حاکموں کو ان کے اپنے عہدے کے ذریعے فائدہ حاصل کرنے سے روک دیا، کیوں کہ اس سے بھی رشوت کے بڑھاوے کا امکان تھا، حضرت ابو حمید الساعدی سے مروی ہے کہ:

عن أبي حميد الساعدي -رضي الله عنه- قال: استعمل النبيﷺ- رجلا من الأزد، يقال له: ابن اللُّتْبِيَّةِ على الصدقة، فلما قدم، قال: هذا لكم، وهذا اهدى لى، فخطب النبى ﷺفحمد الله و اثنىٰ عليه ، ثم قال: «أما بعد: فإني أستعمل رجالا منكم على امور مما وَلاَّنِي الله، فيأتي احدكم فيقول: هذا وهذا هديةاهديت لى فهلا جلس فى بيت ابيه و فى بيت امهٖ فينظر ايهدى له ام لا والذى نفسى بيده لاياخذ احد منه شيئاً الا جاء بهٖ يوم القيامة يحمله علىٰ رقبتهٖ الخ[مشکوٰۃ شریف ج۱ ص۱۵۶ مجلس برکات مبارک پور]

حضور ﷺ نے قبیلۂ ازد کے ایک آدمی کو (جن کا نام ابن اللتبیہ تھا) صدقہ کے وصول کرنے کا عامل مقرر فرمایا، پھر جب وہ واپس آئے تو انہوں نے کہا: اتنا مال آپ کے لیے ہے، اور میرے لیے بطور تحفہ پیش کیا گیا ہے، حضور ﷺ نے خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اللہ کی حمد و ستائش کی، پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا مجھ کو والی بنایا ہے، ان میں سے بہت سے امور پر تم میں سے کچھ لوگوں کو عامل مقرر کرتا ہوں، ایک شخص میرے پاس آکر کہتا ہے یہ آپ کے لیے ہے، اور یہ ہدیہ ہے، جو مجھے پیش کیا گیا ہے، کیوں نہیں وہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھا رہتا، پھر دیکھتا کہ اس کو ہدیہ پیش کیا جاتا ہے یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ جو چیز بھی لے گا اس کو قیامت کے دن

اپنی گردن پر لادے ہوئے لائے گا۔

اس حدیث سے ائمہ کرام حکام کے لیے ناجائز قرار دیتے ہیں کہ وہ کسی شخص سے ہدیہ قبول کریں، ہاں اگر کوئی حاکم قریبی رشتہ دار ہو یا عہدۂ قضا پر فائز ہونے سے پہلے باہم تحائف کا تبادلہ ہوتا رہا ہو تو یہ دوسری بات ہے، اس کے جواز میں کلام نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان دونوں صورتوں کے علاوہ میں اگر وہ ہدیہ قبول کرتا ہے تو گویا وہ اپنے عہدے سے فائدہ حاصل کرنے والا ہے، جو رشوت کا قریبی راستہ ہے، یا عادلانہ فیصلہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کا یہ سبب بن سکتا ہے، رشوت خواہ مالی یا ذہنی ہو دونوں طرح کی رشوتیں اسلام کی نگاہ میں نہایت ناپسندیدہ ہیں، اسی وجہ سے حکام کو شریعت اسلامی محتاط روش اختیار کرنے کی تلقین وہدایت کرتی ہے، اور حاکموں کے خوش کرنے کے ایسے طریقوں کو پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھتی ہے جن میں کسی طرح ان کا فائدہ ملحوظ ہو، چناں چہ عہد فاروقی کا ایک مشہور واقعہ بڑا سبق آموز ہے، جس کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مؤطا" میں ذکر کیا ہے کہ:

مدینہ منورہ سے ایک لشکر عراق کی طرف روانہ ہوا، اس میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادے حضرت عبداللہ و عبید اللہ رضی اللہ عنہما شریک رہے، وہ واپس ہوتے ہوئے بصرہ کے حاکم ابو موسیٰ اشعری کے پاس آئے، انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ان دونوں کا استقبال مرحباً اھلاً و سھلاً کے الفاظ سے کیا، پھر کہا کہ اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو تم دونوں کو کسی طرح ضرور فائدہ پہنچاتا، پھر کچھ سوچ کر فرمایا کہ میں ضرور فائدہ پہنچا سکتا ہوں، وہ یہ کہ میرے پاس بیت المال کا سرمایہ ہے، جس کو میں امیر المؤمنین فاروق اعظم کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں، وہ سرمایہ تم دونوں کو بطور قرض دے رہا ہوں، یہاں سے عراق کا سامان خرید لو، پھر مدینہ منورہ جاکر بیچ دو، اصل سرمایہ تم دونوں امیر المؤمنین کو دے دینا اور جو کچھ نفع حاصل ہو وہ تمھارا ہوگا، اس تجویز کو عبداللہ اور عبیداللہ رضی اللہ عنہما نے پسند کیا اور بیت المال کا وہ سرمایہ بطور قرض لیا، اور اس سے کافی سامان خریدا، اور حضرت فاروق اعظم کے پاس ابو موسیٰ اشعری نے یہ خط لکھا کہ آپ اپنے بچوں سے بیت المال کا سرمایہ وصول کرلیں، جب یہ دونوں حضرات مدینہ منورہ واپس آکر اموال تجارت فروخت کیے تو ان کو نفع حاصل ہوا، جس کو اپنے پاس رکھ لیا اور اصل رقم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو پیش کیا اور ابو موسیٰ اشعری والی

بات ان کو بتائی، فاروق اعظم نے فرمایا کیا تمام فوجیوں کو قرض دیا تھا جیسا کہ تم دونوں کو دیا تھا، صاحبزادگان نے نفی میں جواب دیا، تو انہوں نے فرمایا کہ تم دونوں امیر المؤمنین کے (یعنی میرے) بیٹے ہو، اس لیے تم کو قرض دیا گیا، اصل مال مل گیا ہے، منافع بھی بیت المال میں جمع کردو، حضرت عبداللہ تو خاموش رہے مگر حضرت عبیداللہ نے یہ عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین آپ کے لیے یہ بات زیبا نہیں، بالفرض اگر مال گم ہوجاتا یا ہلاک ہوجاتا تو ہم پر اس کا ضمان لازم ہوتا، فاروق اعظم نے ان کی یہ دلیل تسلیم نہیں کی اور ارشاد فرمایا کہ مال ادا کردو، عبداللہ پھر خاموش رہے اور عبیداللہ نے اپنی پہلی والی دلیل دہرائی، فاروق اعظم کی مجلس میں ایک شخص موجود تھا، اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! اس معاملہ کو آپ اس طرح رفع دفع کرسکتے ہیں کہ اس کو مضاربت بنادیں، چنانچہ فاروق اعظم نے اس کو مضاربت بنادیا، پھر تمام راس المال اور نصف منافع بیت المال کے لیے وصول کیا اور نصف نفع میں دونوں فرزند شریک ہوئے۔ (موطا امام مالک ص ۲۸۵)

حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روایت کردہ اس اثر سے حسب ذیل امور ثابت ہوئے:

(الف) عہد فاروقی میں مضاربت کا رواج تھا، اور شرعاً مضاربت جائز ہے، اس میں شرکت بھی ہوسکتی ہے۔

(ب) اگر کوئی ماتحت اپنے حاکم کو خوش کرنے کی کوشش کرے تو اس کو چاہئے کہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے اور محض خوش ہوکر عدل وانصاف کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔

(ج) بیٹے کے ساتھ حسن سلوک کرنا باپ کو خوش کرنے کے مترادف ہے، یا دل و دماغ کو متاثر کرنے کا بہترین طریقہ ہے، اگر کوئی باپ اعلیٰ عہدے پر فائز ہو تو اس کو احتیاط کی روش اختیار کرنی چاہئے، کیوں کہ بیٹے کے ساتھ حسن سلوک کبھی "ذہنی رشوت" ہوسکتی ہے، جو انصاف کے صحیح راستے سے ہٹادے۔

احادیث اور فقہی جزئیات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ رشوت کی طرف پہنچانے والے راستے نہایت خفیہ اور پوشیدہ بھی ہوتے ہیں، ان سب سے احتراز لازم ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال ذہن پر ابھر کے سامنے آتا ہے کہ ایسا سماج جس میں رشوت کا

دور دورہ ہو اور اپنے جائز حق کے حصول میں رشوت کے بغیر کام نہ چل رہا ہو، تو کیا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ رشوت نہ دے اور اپنے حق سے دست بردار ہو جائے، کیا اسلامی شریعت اپنے حق کے حصول کے لیے بھی رشوت کے دروازے کو سختی کے ساتھ بند کرتی ہے؟ یا بوجہ مجبوری، اس میں کچھ جواز کا پہلو ہے، محقق علی الاطلاق حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

اما اگر برائے اثبات حق و دفع ظلم از نفس بدہند لا باس بہ است، ہم چنیں اگر گیرندہ سعی کند در رسیدن حق بصاحب حق یا دفع ظلم از وے۔[اشعۃ اللمعات ج۳ص۳۲۶]

لیکن رشوت جب کہ اپنے حق کے حصول کے لیے دے دیا یا اپنی ذات سے ظلم کو دفع کرنے کے لیے دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، یوں ہی جب کوئی شخص رشوت اس لیے لے کہ کسی حق والے کو اس کے حق کے پہنچانے میں کوشش کر رہا ہے یا اس سے ظلم کو دفع کر رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عذر معقول کی بنا پر رشوت لینا دینا مباح ہے، لیکن اس مقام پر یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ رشوت لینے کی اباحت صرف ایسے لوگوں کے لیے ہے جو قاضی اور حاکم نہ ہوں، اور جو لوگ صاحب اقتدار ہوں کہ رشوت کے بغیر دوسرے کا حق دلا سکتے ہوں تو ان کے لیے کسی حالت میں رشوت لینا جائز نہیں ہے، چناں چہ حضرت شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اما گفتہ اند کہ ایں در غیر قضاۃ وولاۃ است، زیرا کہ سعی در اصابتِ حق واثبات آں ودفع ظلم از مظلوم واجب است برایشاں پس روا نباشد اجرت گرفتن برآں۔[اشعۃ اللمعات ج۳، ص۳۲۶]

علمائے اسلام نے کہا ہے کہ یہ حکم قاضیوں اور حاکموں کے علاوہ کے لیے ہے، اس لیے کہ مستحق کو اس کا حق پہنچانے کے لیے جدوجہد کرنا اور مظلوم سے ظلم کا دفع کرنا ان کے اوپر واجب ہے، تو اس پر اجرت لینا جائز نہ ہوگا۔

۴۔ خیانت:

جب کوئی شخص اپنے مال و متاع سونا، چاندی، زیورات کی حفاظت کرنے سے خود قاصر ہوتا ہے، اور اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ قیمتی چیزیں اگر میرے پاس رہیں تو ممکن ہے کہ ضائع

ہوجائیں تو وہ دوسرے کے پاس اس کو دیانت دار سمجھ کر اس سے حفاظت کا عہد لے کر امانت رکھ دیتا ہے، امین کے ذمے لازم ہے کہ ان اشیا کی حفاظت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے، ان میں کمی بیشی نہ کرے، خورد بُرد کرنے سے باز رہے، بلفظ دیگر خیانت جیسے جرم عظیم سے اپنے کو محفوظ رکھے، قرآن حکیم میں امین کو اللہ سے ڈرنے کا حکم دے کر اس جرم عظیم سے روکا گیا ہے۔

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۔[البقرة، پ۳، آیت ۲۸۳]

ترجمہ: اگر تم میں ایک دوسرے پر اطمینان ہو تو وہ جسے اس نے امین سمجھا تھا اپنی امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور گواہی نہ چھپاؤ، جو گواہی چھپائے گا، تو اندر سے اس کا دل گنہ گار ہے، اور اللہ تمھارے کاموں کو جانتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں خدائے قدوس نے اپنے رسول اکرم ﷺ کی طرف اگرچہ کلام کا رخ پھیرا ہے، لیکن در اصل ہدایت و تنبیہ امت مسلمہ کے لیے ہے کہ امن کی حالت میں خیانت جائز نہیں ہے، جنگ کی حالت میں بھی، جب کہ بہت سے امور مباح ہوجاتے ہیں، اس میں بھی یہ بد دیانتی مباح نہیں ہو سکتی، چناں چہ ارشاد ربانی ہے:

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۔[آل عمران:۱۶۱، پ۴]

ترجمہ: اور کسی نبی پر یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہ کچھ چھپائے رکھے (یعنی اموال غنائم میں خیانت کرے) اور جو چھپائے رکھے گا وہ قیامت کے دن اپنی چھپائی ہوئی چیز کو لے کر آئے گا، پھر ہر جان کو اس کی کمائی بھرپور دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ نے خیانت کو اتنا بڑا جرم قرار دیا کہ یہ مومن کی شان سے بعید ہے کہ اس کا صدور اس سے ہو اور یہ بتایا کہ اس جرم کے مرتکب اسلام کے چھپے ہوئے دشمن اور مخالف ہوتے ہیں، یعنی نفاق کی علامت ہے، آپ نے فرمایا:

اربع من کن فیه کان منافقا خالصاً و من کانت فیه خصلة منهن کانت فیه خصلة من النفاق حتی یدعها اذا اوتمن خان و اذا حدث

كذب و اذا عاهد غدر و اذا خاصم فجر۔[صحیح البخاری باب علامۃ المنافق ج1ص10،قدیمی کتب خانہ کراچی]۔

چار باتیں ایسی ہیں کہ جس آدمی میں وہ پائی جائیں وہ خالص منافق ہو گا، اور جس شخص کے اندر ان میں سے ایک خصلت پائی جائے، تو اس میں نفاق کا ایک حصہ ہے، یہاں تک کہ ان باتوں کو وہ چھوڑ دے ،اور وہ چیزیں یہ ہیں کہ (۱) جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے (۲) اور گفتگو و بات چیت میں جھوٹ بولے (۳) اور معاہدہ کرکے اس کی خلاف ورزی کرے (۴) لڑائی جھگڑے میں گالی گلوچ بکے۔

اس حدیث شریف سے عیاں ہے کہ خیانت کرنے والا اگرچہ دائرہ اسلام سے خارج ہوکر منافقین کے زمرے میں داخل نہیں ہو گا جو اسلام کے چھپے ہوئے دشمن ہیں، اور جن کے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد ہوا کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے، تاہم یہی کیا کم گناہ ہے کہ کسی شخص میں نفاق کی علامت پائی جائے اور وہ ایمان کامل کے درجے پر فائز نہ ہو، ایمان کامل کا تقاضا یہ ہے کہ امانت میں خیانت کے جرم کا مرتکب نہ ہو اور جس طرح اس نے فراخ دلی کے ساتھ امانت کی حفاظت کی ذمہ داری اجر و ثواب کی نیت سے قبول کی ہے اسی طرح ایمان داری و بہادری کے ساتھ اس کی حفاظت و صیانت کرے ،فقہاے اسلام نے امانت کے جو احکام بیان کیے ہیں، ان میں اس بات کی صراحت ہے کہ امانت کے مال میں تغیر و تبدل ایک قسم کی خیانت ہے، اس سے اجتناب ضروری ہے، اگرچہ امین کے اس عمل سے اس کی قیمت اور مالیت نہ گھٹے۔

۵۔ مضاربت اور اس کی شرائط باطلہ

بعض لوگوں کے پاس سرمایہ اور دولت کی بہتات ہوتی ہے ،اور وہ تجارت اور کاروبار کی اہلیت نہیں رکھتے، نہ ہی ان کو اس کا تجربہ ہوتا ہے، اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس سرمایہ اور دولت نہیں ہوتی، مگر وہ تجارت کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہیں اس لیے تمدنی زندگی میں شریعت اسلامیہ نے یہ جائز قرار دیا کہ کوئی شخص اپنا سرمایہ دوسرے کو دے کر اس سے معاہدہ کرے کہ تم میرے روپئے سے تجارت کرو، ہم دونوں نفع میں شریک رہیں گے،

علامہ برہان الدین مرغینانی فرماتے ہیں:

بعث النبی ﷺ والناس یباشرونه فقرّر هم علیه و تعاملت به الصحابة۔[ھدایہ ج۳ص ۲۶۲، مکتبہ رحمانیہ لاہور]

سرکار علیہ السلام مبعوث ہوئے، لوگ باہم مضاربت کرتے تھے جس کو آپ نے برقرار رکھا اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا اس پر تعامل رہا۔

شمس الائمہ امام سرخسی قاسم بن محمد رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کرتے ہوئے مضاربت کے جواز کا ثبوت فراہم کرتے ہیں:

عن قاسم بن محمد قال :کان لنا مال فی ید عائشة رضی الله عنها و کانت تدفع مضاربةً فبارک الله لنا فیه سعیها و کان عمر رضی الله عنه یدفع مال الیتیم مضاربةً۔(المبسوط ج۲۲ص۱۸ادارالمعرفۃ بیروت)

قاسم بن محمد نے کہا کہ ہمارا مال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اور وہ اس کو مضاربت میں دیتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ کی کوشش سے اس میں برکت عطا فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یتیم کے مال کو مضاربت پر دیتے تھے۔

بہر حال مضاربت کے جواز میں شبہ نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ عقل و نقل دونوں کی شہادت پائی جاتی ہے، اس میں ایک فریق سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس سرمائے سے کاروبار کرتا ہے اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ مثلاً منافع میں نصف نصف دونوں شریک رہیں گے یا جو بھی باہمی رضامندی سے طے ہوجائے مثلاً کاروبار کرنے والے کو ایک ربع نفع دیا جائے اور باقی منافع رب المال کو ملے۔

لیکن عہد حاضر میں شرکت اور مضاربت میں ایسی شرطیں لگائی جاتی ہیں جن سے مضاربت یا تو فاسد یا باطل ہوجاتی ہے، سرمایہ دار اپنی دولت کے سہارے اپنے مضارب کو ایسی شرطیں ماننے کے لیے مجبور کرتا ہے جس سے مضاربت کی ہیئت یا حقیقت بدل جاتی ہے اور شرعی قباحت کی حد میں یہ معاہدہ داخل ہوجاتا ہے، کاروبار کرنے والے پر ایک قسم کا ظلم و تعدی ہوتا ہے، اس لیے اسلامی قوانین کے ماہرین نے ان امور کا ذکر کیا ہے جن سے مضاربت باطل ہوجاتی ہے ان میں سے کچھ کا تذکرہ مختصراً یہاں کیا جارہا ہے:

(الف) اگر متعیّن نفع کی اس طرح شرط لگادی کہ پچاس روپۓ یا سوروپۓ ماہانہ ہم کو ملتے رہیں تو یہ مضاربت نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا ربٰو ہے جو باطل و حرام ہے ،اس لیے کہ ہو سکتا ہے پچاس ہی روپۓ یا سوروپۓ کا نفع اس کاروبار میں ہو تو بیچارہ وہ کیا پاۓ گا جس نے اپنی محنت ، قابلیت اور اپنی ذہانت و تجربے کو صرف کر کے یہ نفع کمایا تھا۔

(ب)۔ نصف یا ربع نفع کا جو معاہدہ ہوا ہے اس پر اضافے کی کسی متعیّن رقم کی شرط لگانا مضاربت کو باطل کر دے گا ، مثلاً ایک سرمایہ دار یا رب المال نے کسی دوسرے کو دس ہزار روپۓ کاروبار کرنے کے لیے دیئۓ اور یہ معاہدہ کیا کہ منافع میں ہم دونوں نصف نصف شریک رہیں لیکن یہ بھی شرط لگادی کہ نصف کے علاوہ مجھ کو مزید پچاس روپۓ ملنا چاہئے اس سے بھی مضارت باطل ہو جاۓ گی اور کاروبار کرنے والے کو اجرت مثل ملے گی۔

(ج) بعض اہل ثروت اپنا سرمایہ کسی غریب کو دے کر یہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ایک ہزار روپۓ ماہانہ مثلاً دیتے رہو، باقی مجھ کو تمھارے نفع نقصان سے کوئی غرض نہیں ہے، اگر تجارت میں تم کو وہ نفع ہو تو وہ تمھارا رہے گا یا نقصان ہو تو تمھارے ذمے آۓ گا، مجھ کو صرف ایک ہزار روپۓ ماہانہ ملنا چاہئے اور میرا راس المال یعنی اصل رقم تمھارے ذمے ہر حالت میں لازم رہے گی، در حقیقت یہ مضاربت نہیں ہے بلکہ عقد باطل ہے جو شرعًا ناجائز و حرام ہے ،ایک کاروباری کے لیے یہی نقصان کیا کم ہے کہ اس نے اپنی محنت ، اپنی دوڑ دھوپ ، اپنی ذہانت و قابلیت سب کچھ صرف کی لیکن اس کو کچھ حاصل نہ ہوا، اب اگر اس کے اوپر نقصان و خسارے کا بار ڈالا جاۓ تو یہ ظلم شدید ہو گا ،اس لیے مضاربت کے بنیادی اصولوں میں یہ داخل ہے کہ اگر کاروبار میں خسارہ ہو جاۓ تو یہ صرف رب المال کے ذمے آۓ گا اور جو شخص اس سے سرمایہ لے کر کاروبار کر رہا ہے اس سے وہ بری الذمہ ہو گا، کیوں کہ وہ بہت بڑا نقصان اٹھا چکا ہے کہ اتنی ساری محنت کے باوجود اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

٦۔ شرکت اور اس کے بطلان کے وجوہ

یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ دو یا دو سے زائد افراد کسی کاروبار میں شرکت کریں تو یہ جائز ہے لیکن دور جدید میں بڑی بڑی کمپنیوں کا قیام ہوتا ہے اور اس میں سیکڑوں لوگ اپنی

دولت جمع کر کے شریک ہوتے ہیں، ان کے جو شرائط اور قواعد مقرر کیے جاتے ہیں وہ شریعت اسلامی کی نگاہ میں قطعاً باطل ہیں، جیسے بینک، لائف انشورنس، ملوں اور کارخانوں کی کمپنیاں ہوتی ہیں جو تاجرانہ کاروبار کرتی ہیں، ان میں جو شخص روپیہ جمع کرتا ہے اس کو متعیّن نفع اس کے سرمایے کا پانچ فیصد یا چھ فیصد یا دس فیصد دیا جاتا ہے، خواہ ایسی کمپنیاں خسارے میں چلیں یا نفع میں، ہر حالت میں اس میں روپیہ جمع کرنے والوں کو نفع ملتا رہے گا، اس قسم کی کمپنیوں کا قیام اور ان میں شریک ہونا جائز نہیں ہے اور نہ ایسی تجارت ہی درست ہے، تنویر الابصار میں ہے:

الشركة عبارة عن عقد بين المتشاركين فى الاصل والربح ۔[تنویرالابصار ج ۳ص ۳۳۳، الدرالمختار کتاب الشرکۃ ص ۳۶۲، دارالکتب العلمیۃ بیروت]

شرکت ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں شرکا اصل اور نفع میں شریک رہیں۔

تنویرالابصار اور اس کی شرح در مختار میں ہے:

شرطها اى شركة العقد عدم مايقطعها كشرط دراهم مسماة لاحد هما ،لانه قد لا يربح غير المسمّٰى و حكمها الشركة فى الربح۔[الدر المختار ج ۳ص ۳۳۷]

معاہدۂ شرکت کی شرط یہ ہے کہ تمام وہ چیزیں معدوم ہونی چاہئیں جو شرکت کو ختم کر دیں، مثلاً دونوں میں سے ایک کے لیے متعیّن درہم کی شرط لگانا، اس لیے کہ کبھی متعیّن کے علاوہ نفع نہیں ہوتا ہے، حالاں کہ اس کا حکم نفع میں شرکت ہے۔

البتہ اگر کمپنیاں قائم کی جائیں یا مسلمان ایسے بینک قائم کریں کہ وہ بینک یا کمپنیاں اسلامی اصولوں پر قائم ہوں تو ضرور اس کے "شیر و حصص" کو خریدا جاسکتا ہے، یعنی اس میں شرکت کی جاسکتی ہے، اس کا ثبوت حضرت سائب رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ہے:

عن السائب ان النبى ﷺ شاركه قبل الاسلام فى التجارة ،فلما كان يوم الفتح جاءه ،فقال عليه السلام: مرحباً باخى و شريكى، كان لايدارئ ولا يمارى، يا سائب !قد كنت تعمل اعمالاً فى الجاهلية لا تقبل منك و هى اليوم تقبل منك۔[فتح القدیر کتاب الشرکۃ ج ۶ ص ۱۴۳۔۱۴۴]

حضرت سائب سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے قبل اسلام تجارت میں ان سے شرکت کی تھی، فتح مکہ کے دن جب وہ حاضر دربار ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا: خوش آمدید! میرے بھائی اور میرے شریک میرے ساتھ تجارت میں نہ تم رکاوٹ ڈالتے تھے اور نہ جھگڑتے تھے، اے سائب! عہد جاہلیت میں تمھارے اعمال مقبول نہیں ہوتے تھے آج کے دن تمھارے اعمال اللہ کی بارگاہ میں قبول ہورہے ہیں۔

یہ حدیث پاک واضح طور سے دلالت کررہی ہے کہ شرکت کا کاروبار نہ صرف جائز ہے بلکہ حضور اکرم ﷺ کی سنت کریمہ ہے، لیکن فقہاے کرام نے اس کے بارے میں کچھ ایسے ضوابط متعیّن کیے ہیں جن سے کسی فریق کی حق تلفی نہ ہوسکے، اس لیے اگر ایسی کمپنی قائم کی جائے جس میں پچاسوں آدمی شریک ہوں تو اخراجات کو الگ کرنے کے بعد جو منافع حاصل ہوں ان میں وہ لوگ اپنے سرمایہ کی نسبت سے شریک ہوں اور اسی نسبت سے خسارے میں بھی شریک ہوں تو ایسی کمپنی کے قیام کے جواز میں شبہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن دور جدید میں شرکت کے جتنے ادارے قائم کیے جاتے ہیں ان میں بیشتر شرکا اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ہمارا اصل سرمایہ ہر حالت میں محفوظ رہے، خواہ کمپنی کو نفع ہو یا نقصان، اسی وجہ سے جب کوئی کمپنی قائم کی جاتی ہے اور اس کے حصے فروخت کیے (اس گفتگو کا تعلق حصص بازاری سے نہیں ہے) جاتے ہیں تو حصہ خریدنے والا پہلے سے یہ اطمینان حاصل کرلیتا ہے کہ ہمارے اصل سرمایہ میں کمی تو نہیں آئے گی؟ اس کے لیے وہ متعیّن نفع کی شرط لگاتا ہے، یہی وہ ذہنیت یا نفسانیت ہے جہاں سے وہ اسلامی اصول و قوانین سے ٹکراتا ہے، جس سے کاروبار شرعی قباحت کی حد میں داخل ہوجاتا ہے، ورنہ اگر مسلمان اسلامی اصول کے دائرے میں رہ کر شرکت کے ادارے قائم کرتے اور اس سے ملوں اور فیکٹریوں کو فروغ بخشتے تو اس سے مسلمانوں کی معیشت میں بڑا زبردست انقلاب پیدا ہوتا اور مسلمانوں کی معاشی حالت کے سدھارنے میں بڑی مدد ملتی، اس لیے کہ حضور ﷺ جب مبعوث ہوئے تو لوگ شرکت کا کروبار کرتے تھے، آپ نے نہ صرف اس کو برقرار رکھا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔

شرکت فاسدہ کے چند مسائل

شرکت میں اگر ایک ہی کا مال ہو یا ایک ہی کی چیز ہو تو جو کچھ نفع حاصل ہوگا وہ رب المال

کو ملے گا اور دوسرے کو اس کام کی اجرت ملے گی، مثلاً ایک شخص نے اپنا جانور (یا اپنی ٹیکسی، جیپ، آٹو رکشہ وغیرہ) دوسرے کو دیا کہ اس کو کرائے پر چلاؤ اور کرائے کی آمدنی میں نصف نصف ہم شریک ہوں گے، یہ شرکت فاسد ہے، کل آمدنی مالک کو ملے گی اور اجیر کو عام طور سے اس قسم کے کاموں کے لیے جو مزدوری ملتی ہے وہی دی جائے گی جس کو اجرت مثل کہا جاتا ہے۔[الدرالمختار ج۳ص۳۵۰:بہار شریعت، حصہ دہم، ص ۵۱۵ مکتبۃ المدینہ کراچی]

اگر ایک شخص نے اپنا جانور (یا دوسرے ذرائع حمل و نقل جیسے ٹیکسی وغیرہ) دوسرے کو دیا کہ تم اس پر اپنا سامان لاد کر پھیری کرو، منافع میں ہم دونوں شریک رہیں گے، یہ شرکت بھی فاسد ہے، نفع کا مالک پھیری کرنے والا ہوگا، جانور کے مالک کو اجرت مثل ملے گی۔

اگر حمّالوں نے آپس میں شرکت عمل یوں کی کہ کوئی بورے میں غلہ بھرے گا اور کوئی اٹھا کر دوسرے کی پیٹھ پر رکھے گا اور کوئی مالک کے گھر پہونچائے گا اور جو کچھ مزدوری ملے گی سب برابر برابر تقسیم کرلیں گے تو یہ شرکت بھی فاسد ہے۔(عالمگیری ج۲ص۱۵، بہار شریعت، حصہ دہم ص۵۱۶، مکتبۃ المدینہ)

اگر کسی شخص نے اپنی گائے دوسرے کو دے کر شرکت کا بایں طور معاہدہ کیا کہ دوسرا آدمی اس گائے کو چارہ کھلائے، پالے پوسے اور جو بچہ پیدا ہو اس میں وہ نصف نصف برابر کے شریک ہوں گے تو یہ شرکت بھی فاسد ہے، بچہ گائے کے مالک کا ہوگا اور دوسرے شخص کو اس کے چارہ کھلانے اور دیکھ بھال کی اجرت ملے گی۔[الدرالمختار و بہار شریعت ج ۱۰ص۵۱۶، مکتبۃ المدینہ]

شریک کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنے شریک کی اجازت کے بغیر اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کردے، اگر زکوٰۃ ادا کرے گا تو اس کو تاوان دینا پڑے گا اور زکوٰۃ بھی ادا نہ ہوگی۔[الدرالمختار ج۳ص ۳۵۱، بہار شریعت ج ۱۰، ص۵۱۸۔مکتبۃ المدینہ]

ایک کھیت مشترک ہے، دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر کچھ بو دیا، اب دوسرا شریک کہتا ہے کہ نصف بیج میں دینا چاہتا ہوں تاکہ پیداوار مشترک ہوجائے، اگر بیج کھیت کے جمنے کے بعد دیا ہے تو جائز ہے اور اگر پہلے دیا ہے تو ناجائز ہے۔[الدرالمختار ج۳، ص۳۵۶/ بہار شریعت ج ۱۰، ص ۵۲۴۔مکتبۃ المدینہ]

کوئی شریک دوسرے شریک کے اذن کے بغیر مال شرکت کو رہن نہیں رکھ سکتا، اگر رہن پر رکھے گا تو یہ ناجائز ہوگا۔(بہار شریعت، ج: ۱۰، ص۵۰۶، مکتبۃ المدینہ)

ہندوستان میں باپ کے مرنے کے بعد اس کے تمام بیٹے ترکہ پر قابض ہو جاتے ہیں، جائداد منقولہ اور غیر منقولہ شرعی طور پر تقسیم نہیں کی جاتی، بلکہ مشترک رہتی ہے، لین دین تجارت و زراعت حتیٰ کہ کھانا پینا کبھی مدتوں ایک ساتھ رہتا ہے، یہ شرکت ملک ہے، اس صورت میں جو کچھ تجارت و زراعت کے ذریعے اضافہ کریں گے ان سب میں سب برابر کے شریک ہوں گے، اگرچہ کسی نے زیادہ کام کیا ہو کسی نے کم، کوئی کاروبار میں مہارت رکھتا ہو کوئی ناتجربہ کار ہو، اگر ان شرکا میں سے بعض نے کوئی خاص چیز اپنے لیے خریدی تو یہ چیز اسی کی ہوگی لیکن بقیہ شرکا کو ان کے حصے کا تاوان دینا ہوگا۔ [بہار شریعت ج ۱۰، ص ۴۹۶، مکتبۃ المدینہ)

اجارۂ فاسدہ کے چند مسائل

مزدوری اجرت پر کام کروانا یا کرنا شرعاً جائز ہے، یہاں تک کہ اس میں مسلمان اور کافر کی کوئی قید نہیں ہے، اگر کوئی مسلمان مزدور کسی کافر کے یہاں مزدوری یا ملازمت کرے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں پائی جاتی، یوں ہی کوئی مسلمان اپنے مکان کو کرائے پر کسی کافر کو دے تو یہ بھی شرعاً جائز ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اجارے میں ان شرائط و قیود کا لحاظ رکھا جائے جن کو شریعت اسلامیہ نے حق تلفی سے روکنے اور انصاف کے لیے متعیّن کیے ہیں، اب اگر ان کی پابندی نہ کی جائے تو اس سے فساد پیدا ہوتا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجارۂ فاسدہ کے چند مسائل اس موقعہ پر ذکر کر دیئے جائیں:

۱۔ اگر کسی شخص نے گائے یا بھینس خرید کر دوسرے کو اس شرط پر دیا کہ اس کو کھلائے پلائے، دیکھ بھال کرے اور جو کچھ دودھ ہوگا دونوں میں نصف نصف تقسیم ہو جائے گا، کل دودھ مالک کے لیے ہوگا اور دوسرے کو اس کے کام کی اجرت ملے گی اور اس نے جو اپنے پاس سے کھلایا پلایا ہے اس کی قیمت مالک کو دینی پڑے گی، اگر دوسرے شخص نے دودھ استعمال کیا ہے تو مالک کو اتنا ہی دودھ واپس دے۔ [عالمگیری ج ۳ ص ۵۲۴ / بہار شریعت، ج ۱۴، ص ۱۵۱، مکتبۃ المدینہ]

۲۔ دیہاتوں میں جب کھیت کٹتا ہے تو بالیں ٹوٹ کر گر جاتی ہیں، کاشت کار ان بالوں کو چنواتا ہے، اس کی مزدوری اسی میں دیتا ہے، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کھیت کاٹنے والے کو اسی سے مزدوری دی جاتی ہے یہ ناجائز ہے۔ [بہار شریعت چہاردہم ص ۱۵۱، مکتبۃ المدینہ]

۳۔ اگر کسی شخص نے کپڑا بننے کے لیے سوت دیا اور یہ کہہ دیا کہ آدھا کپڑا اجرت میں لے لینا یا غلہ

اٹھا کر لاؤ اسی میں سے دو سیر مزدوری ملے گی یا چکی مشین والے کو آٹا پیسنے کے لیے دیا اور اسی آٹے سے اجرت دینے کا معاہدہ کیا تو یہ سب اجارے بھی ناجائز ہیں۔[بہار شریعت چہاردہم ص ۱۵۰، مکتبۃ المدینہ]

۴۔کسی آدمی نے مکان یا اپنی دکان کرائے پر اس شرط پر دی کہ اس کی مرمت یا مکان کا ٹیکس وغیرہ کرایہ دار کے ذمے ہوں گے تو یہ اجارہ بھی فاسد ہے کیوں کہ ان چیزوں کا تعلق مالک مکان سے ہے، کرایہ دار کے ذمے یہ شرط لگانا مقتضائے عقد کے خلاف ہے۔[الدر المختار کتاب الاجارۃ، باب اجارۃ الفاسد، ج۵ ص۲۹]

۵۔بعض لوگ گائے، بکری وغیرہ کو بٹائی پر دیتے ہیں کہ جو بچے پیدا ہوں گے دونوں نصف نصف لیں گے، یہ ناجائز ہے، بچے مالک ہی کے ہوں گے اور دوسرے کو اجرت مثل ملے گی ۔[بہار شریعت چہاردہم ص ۱۵۲، مکتبۃ المدینہ]

۶۔قرآن حکیم کی تلاوت کرنے والوں کو میت کے ایصال ثواب کے لیے اجرت پر رکھنا ناجائز ہے، سوم وغیرہ کے موقع پر اجرت پر قرآن حکیم پڑھوانا ناجائز ہے، اجرت دینے والا اور لینے والا دونوں گنہ گار ہیں، اسی طرح بہت سے لوگ چالیس روز تک میت کی قبر کے پاس یا اپنے مکان پر کسی حافظ قرآن سے چالیس روز تک اجرت پر میت کے ایصال ثواب کے لیے قرآن شریف پڑھواتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے، اس صورت میں ایصال ثواب بے معنیٰ بات ہے، اس لیے کہ جب پڑھنے والے نے پیسوں کی خاطر پڑھا تو اس کو ثواب ہی نہیں ملے گا، پھر ایصال ثواب کیا ہوگا، اس کو تو اس کا بدلہ دنیا ہی مل گیا، لاریب ایصال ثواب جائز بلکہ مستحسن امر ہے، مگر اجرت پر قرآن مجید یا کلمۂ طیبہ پڑھوانا ایصال ثواب نہیں ہے، البتہ پڑھنے والوں کو اللہ کے لیے پڑھنا چاہیے اور ایصال ثواب کرنا چاہیے۔ [بہار شریعت چہاردہم ص ۱۴۷، مکتبۃ المدینہ]

۷۔ختم پڑھنے کے لیے اجرت پر رکھنا ناجائز ہے، مثلاً کوئی آیت کریمہ کا ختم کراتا ہے، کوئی خواجگان پڑھواتا ہے، کوئی کلمہ طیبہ کا ختم کراتا ہے، یہ سب کام اجرت پر ناجائز ہیں۔(بہار شریعت چہاردہم ص ۱۴۸، مکتبۃ المدینہ)

۸۔اگر کسی شخص نے متعیّنہ مدت تک کے لیے اپنے سامان کو کرایہ پر دیا، مثلاً شامیانہ، برتن وغیرہ جو کرایہ پر چلتے ہیں ان کو تین یوم کے لیے کرایہ پر دیا اور یہ شرط لگادی کہ ان کی واپسی کی

ذمہ داری کرایہ پر لینے والے کی ہوگی اور یہ سامان خالی ہونے کے بعد واپس نہ ہوئے تو کرایہ پر لینے والے شخص کے ذمے صرف تین دن کا کرایہ ادا کرنا ہوگا اور ایسی شرط لگانا ناجائز ہے، یعنی یہ شرط فاسد ہے، اسی طرح اگر کسی شخص سے یومیہ ایک متعیّن مقدار پر اپنے سامان کو کرایہ پر دیا، مثلاً یہ سامان جب تک تم مصروف رکھو گے روزانہ تم کو دس روپئے کرائے دینے ہوں گے، کرایہ پر لے جانے والے نے دس دن کے اندر ان تمام سامانوں کو خالی کر دیا، پھر مزید پانچ یوم تک یہ سامان اس کے یہاں پڑے رہے، تو اس کے ذمے صرف دس یوم کا کرایہ ہوگا، اگرچہ سامان کے مالک نے واپسی کی شرط کے ساتھ کرائے پر دیا ہو، یہی حکم ان تمام تعمیری سامانوں کا ہے جو کرایہ پر چلتے ہیں، مثلاً بانس، بلّیاں، پٹرے وغیرہ کرائے پر دیئے گئے، جیسا کہ آج کل لکڑیوں کے تاجر کرتے ہیں اور یہ شرط لگا دی کہ جب تک تم واپس نہیں کرو گے اس وقت تک تم کو برابر کرایہ ادا کرنا پڑے گا اگرچہ یہ سامان ضرورت میں استعمال ہونے کے بعد خالی ہو جائیں تو یہ شرط فاسد ہے جس کا اعتبار نہ ہوگا اور مستاجر کے ذمے اتنے ہی دنوں تک کا کرایہ لازم ہوگا جتنے دنوں تک اپنے یہاں ان سامانوں کو استعمال کرتا رہا۔ [عالمگیری و بہار شریعت چہاردہم ۱۵۵، مکتبۃ المدینہ]

باب ششم

صدقہ اور سود میں تضاد ہے

باب اول سے ہمارے قارئین کرام پر یہ بات واضح ہوگئی کہ سود بدترین گناہ کبیرہ ہے، اس سے ظلم وتشدد کا دور دورہ ہوتا ہے، یہ شقاوت و بے رحمی کے جذبے کو ابھارتا ہے، اس سے بخل و تنگ دلی پیدا ہوتی ہے، اس کے برعکس صدقات و خیرات سے حسن سلوک، اچھا برتاؤ، سخاوت ووسعت قلبی، مظلوم کی دادرسی، بے کس ونادار کی مدد واعانت، غریب فاقہ کش پر شفقت و پیار کے مکارم اخلاق پیدا ہوتے ہیں، اسی لیے قرآن حکیم میں سورۂ بقرہ کی آیات میں جہاں تفصیلاً حرمت ربٰو کا بیان ہوا ہے وہیں صدقات وخیرات کی طرف رغبت بھی دلائی گئی ہے، تاکہ یہ بات لوگوں پر واضح ہوجائے کہ صدقہ وربو کے درمیان مکمل تضاد ہے، اس لیے اگر تاریکی کے سمجھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے، اگر حرارت بغیر برودت کے نہیں سمجھی جاسکتی تو سود کی قباحت وشناعت کا صحیح وجدان اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب کہ زکوٰۃ وصدقات سے طہارت باطن و تزکیۂ نفس کا احساس پیدا ہوجائے، اس لیے آئیے ایک نظر اسلام کے "نظام زکوٰۃ وصدقات" پر ڈالتے چلیں تاکہ انسانی قلوب میں یہ بات راسخ ہوجائے کہ جو سماج و معاشرہ اپنے افراد کے ساتھ بلاکسی معاوضہ کے ایک حبہ خرچ نہیں کرنا چاہتا ہے وہ کتنی پست ذہنیت، کتنی کم ظرفی، کتنی تنگ دلی اور کتنی کم ہمتی میں گرفتار ہے اور وہ معاشرہ جو اپنے بے سہارا افراد وارکان کی مدد واعانت نہایت بے لوثی و بے غرضی کے ساتھ کر رہا ہے وہ کتنا عالی ظرف، کتنا بلند نگاہ اور کتنا حوصلہ مند ہے، دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

چوں کہ اسلام انسان کو ہر مرحلے میں حیوانیت کے بجائے صفات ملکوتی کا حامل بنانا چاہتا ہے اس لیے قرآن حکیم میں نماز جیسی اہم عبادت کے پہلو بہ پہلو بیسوں آیتوں میں زکوٰۃ کا تذکرہ ہوا ہے، عبادت جسمانی کے ساتھ اس عبادت مالی کا ذکر اس کی اہمیت و عظمت کی وضاحت کے لیے کیا گیا ہے اور یہ عقیدہ ذہنوں میں راسخ کرنا تھا کہ جس طرح نماز کا اجر و ثواب اور اس کا ظاہری اور باطنی فائدہ تمھاری ہی طرف لوٹ کر آتا ہے یا تمھیں کو ملتا ہے اسی

طرح جو کچھ تم اپنے کسب حلال سے خدا کی راہ میں صرف کرو گے مآل کے اعتبار سے اس سے تم کو بڑا فائدہ پہونچے گا اور تم کو یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ جو کچھ اپنے جیسے انسانوں پر خرچ کرتے ہو اس میں تمھارا نفع نہیں ہے بلکہ دوسرے ہی لوگوں کا فائدہ ہے، واقعہ تو یہ ہے جو کچھ راہ حق میں صرف کیا جاتا ہے اس کا معاوضہ اتنا ملے گا کہ اس کے تصور سے یہ انسان ضعیف البیان قاصر ہے۔

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ۔[البقرۃ ع ۷ ۳ آیت ۲۷۲]

ترجمہ: اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا ملے گا اور تم نقصان نہیں دیئے جاؤ گے۔

لیکن انسان اتنا حریص الطبع واقع ہوا ہے یا عجلت پسند ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے خرچ کا فائدہ چاہتا ہے اور ایسے منافع کی طرف اس کا طبعی رجحان نہیں ہوتا ہے جو اس کو دیر میں ملنے والا ہو، لیکن قرآن شریف انسان کے مطمح نظر کو بدل دینا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ وہ تجارت کیا سود مند ہے جس میں نفع تھوڑا سا ملے اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے، پھر اصل مال اور نفع دونوں ضائع ہو جائیں، بلکہ ایسی تجارت کرنی چاہئے جس میں نقصان کا اندیشہ کبھی نہ ہو، چناں چہ خدائے قدوس فرماتا ہے:

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۙ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔[فاطر ع ۴ آیت ۲۹-۳۰]

ترجمہ: اور ہمارے دیئے سے جو کچھ ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں پوشیدہ اور ظاہر، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہیں ہے، تاکہ ان کے ثواب انہیں بھرپور دے اور اپنے فضل سے اور زیادہ عطا کرے، بے شک وہ بخشنے والا قدر فرمانے والا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا کہ صدقات و خیرات علانیہ بھی دیئے جاسکتے ہیں اور پوشیدہ طور پر بھی، لیکن اگر نیک کام کیا جائے اور شہرت و ناموری کی غرض سے نہ کیا جائے تو اس سے بہتر کون سی بات ہو سکتی ہے۔

إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ (البقرۃ ع ۳۷ آیت ۲۷۱)

اگر خیرات علانیہ دو تو کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر چھپا کر فقیروں کو دو تو یہ تمھارے لیے سب سے بہتر ہے۔

قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ میں علانیہ اور پوشیدہ طور پر صدقات کے دینے کا اختیار دیا گیا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ تمام صدقات خواہ نافلہ ہوں یا غیر نافلہ اس کے نہ دینے میں سزا کا مستحق نہیں ہو گا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو شخص صدقات واجبہ کو نہیں دے گا وہ سخت سزا کا مستحق ہو گا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ [آل عمران ع ۱۸ آیت ۱۸۰]

ترجمہ: اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی ہے ہر گز اسے اپنے لیے اچھا نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے، عنقریب وہ جس میں بخل کیا تھا قیامت دن ان کے گلے کا طوق ہو گا۔

یعنی بعض لوگ اللہ کی راہ میں اپنے سرمایہ اور دولت کو خرچ نہیں کرتے اور زکوٰۃ کی ادائگی میں کوتاہی کرتے ہیں، ان کو سخت عذاب کی دھمکی دی گئی کہ یہی مال روز محشر ان کے گلے میں عذاب کا طوق بن جائے گا۔

ایک حدیث پاک میں اس آیت کریمہ کی تفسیر خود حضور ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی:

مَن مَنَعَ زَكوٰةَ مَالِهٖ يصير حيّةً ذَكَراً اَقرَعَ لَهٗ نابانِ فَيطوقُ فِى عُنقِهٖ وَيَنهَشهٗ و يَدفَعُه اِلىٰ النَّارِ(مدارک التنزیل ج1 ص ۳۱۶ ،دارالکلم الطیب بیروت)

جس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو وہ مال (روز قیامت) ایک ایسے سانپ میں بدل جائے گا جو گنجا ہو گا اور اس کے دو دانت ہوں گے، اس کی گردن میں یہ سانپ طوق بن جائے گا، پھر وہ اس کو نوچے گا اور دھکے دے کر جہنم تک پہنچا دے گا۔

سورۂ توبہ کی ایک آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (34) يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ

بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ (التوبۃ ع ۵، آیت ۳۴-۳۵)

اور وہ لوگ جو سونا چاندی کو جوڑ کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو، جس دن وہ جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور یہ کہا جائے گا) یہ وہی چیز ہے جو تم اپنی ذاتوں کے لیے جمع کرتے تھے تو اپنے جمع شدہ مال کا مزہ تم چکھو۔

ان آیات مبارکہ میں سخت وعید کے ساتھ مال جمع کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہی ہے کہ اگر اللہ کی عطا سے تمھارے پاس دولت و سرمایہ ہے تو تم کو یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ اس میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے اور نہ اس خام خیال میں مبتلا ہونا چاہیے کہ یہ مال و دولت، اپنی محنت و مشقت اور اپنی دوڑ دھوپ سے حاصل کیا ہے، اس لیے اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے بلکہ ہمیشہ ایک مسلمان کے ذہن میں یہ بات پیوست رہنی چاہیے کہ اس کی کمائی سے بہت سے لوگوں کے حقوق متعلق ہوجاتے ہیں، اس کی صراحت سورۂ نسا کی آیت کریمہ میں کی گئی ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ۔ (النساء ع ۶، آیۃ ۳۶)

ترجمہ: اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور پاس کے ہمسایہ اور دور کے ہمسایہ اور کروٹ کے ساتھ، مسافر اپنے غلام اور باندی کے ساتھ بھی (یعنی ان سب کے ساتھ حسن سلوک کرو، ضرورت پر ان کی مدد کرو، اپنا مال ان کے اوپر صرف کرو)

اس آیت کریمہ میں متعدّد قسم کے اشخاص کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہوا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان سب پر زکوٰۃ ہی کا مال خرچ کیا جائے گا، کیوں کہ سورۂ توبہ کی ایک آیت کریمہ میں زکوٰۃ کے مصارف کو شمار کر دیا گیا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ

قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ۔[التوبۃ ع۸،آیۃ ۶۰]

ترجمہ :زکوٰۃ تو انہیں لوگوں کے لیے ہے (یعنی) محتاجوں ،نرے ناداروں اور جو اسے وصول کرلائیں اور جن کے دلوں کو اسلام سے الفت دی جائے اور گردنیں چھڑانے میں اور قرض داروں کو اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کو۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ سورۂ نسا کی آیت ۳۶ میں جو حسن سلوک کا حکم ہوا ہے اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان سب پر زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے اموال سے ان کی دست گیری ہونی چاہیے۔

سورۂ توبہ کی ایک دوسری آیت کریمہ میں زکوٰۃ کی حکمت بالغہ کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (التوبہ ع ۱۳، آیۃ ۱۰۳)

ترجمہ: اے محبوب ان کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کرو جس سے تم انہیں ستھرا اور پاکیزہ کردو اور ان کے حق میں دعاے خیر کردو، بے شک تمھاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

ظاہر ہے کہ مسلمان اگر زکوٰۃ نہ ادا کرے تو اس سے وہ نجس و ناپاک نہیں ہوتا نہ اس کے دل میں نجاست و آلودگی پائی جاتی ہے، اس لیے آیت کریمہ کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ زکوٰۃ کے ادا کرنے سے قساوت قلبی، بخل، بے رحمی، کم ظرفی جیسے جذبات سفلی سے وہ طیب و طاہر ہو جاتا ہے اور تزکیۂ نفس، طہارت باطن اور رجوع الی الحق کی طرف طبعی رجحان بڑھ جاتا ہے، لیکن اس کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ نام و نمود اور ریا سے عاری ہو کر محض رضاے الٰہی کے لیے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ۔[البقرۃ:۲۶۴]

ترجمہ: اے ایمان والو! احسان جتا کر اور ایذا دے کر اپنے صدقے کو باطل نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی انوکھی حالت ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو، اس پر مٹی پڑی ہوئی ہو، اب اس پر زور کا پانی پڑا، جس نے اسے نرا پتھر بنا کر چھوڑا (ایسے لوگ) اپنی کمائی سے کسی چیز پر قابو نہیں پائیں گے اور اللہ کافروں کو راہ نہیں دیتا۔

اس آیت مبارکہ سے خلوص و بے لوثی کے جذبۂ عالیہ کو ابھارا گیا کہ جو کچھ تم خرچ کرو محض رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرو اور جس شخص کو اپنے صدقے کا مال دو اس کو احسان جتا کر یا اذیت پہنچا کر اپنے صدقے کو ضائع نہ کرو، کیوں کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے پر اپنے صدقے کا مال خرچ کرتا ہے پھر اس پر احسان جتاتا یا اس کو اذیت دیتا ہے تو ایسا محسن اس شخص کی طرح ہے جو کسی دوسرے کو خوش کرنے کے لیے اپنا ہدیہ یا تحفہ پیش کرے یا اس کی شاندار ضیافت کرے پھر اپنی کج خلقیوں یا تنک مزاجی سے ملول خاطر کر دے، گویا ایک طرف وہ خوش کرتا ہے اور دوسری جانب اس کو لاٹھی مارتا ہے، کیا کوئی شریف آدمی ایسا کر سکتا ہے کہ ضیافت بھی کرے اور اس کی پٹائی بھی، اسی لیے اس آیت کریمہ میں یہ بھی فرمایا گیا کہ جس طرح وہ ریاکار جو خدائے قدوس اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا جب اپنا مال خرچ کرتا ہے تو اللہ کی خوشنودی اور یوم آخرت میں صلہ پانے کے لیے نہیں خرچ کرتا ہے بلکہ اپنی سخاوت کے اظہار اور نام و نمود کے لیے خرچ کرتا ہے، اس لیے وہ رائیگاں چلا جاتا ہے، اسی طرح احسان جتانے والے اور اذیت پہنچانے والے کا کیا کرایا سب بے کار ہو جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے پاس دولت و سرمایہ ہو تو اس کو ضرور نیک کاموں میں خرچ کرنا چاہیے اور اس دولت کو صرف اپنی ذات پر منحصر نہیں رکھنا چاہئے بلکہ اس سے دوسروں کو بھی حصہ دینا چاہئے۔

اوپر کی بعض آیات کریمہ پر ایک نظر ڈالنے سے عیاں ہوتا ہے کہ اپنے خرچ کو ”زکوٰۃ“ کی ادائگی پر محدود نہیں رکھنا چاہئے بلکہ دیگر صدقات میں بھی اپنے مال کو صرف کرنا چاہئے، یہ صدقہ واجبہ تو ہر مسلمان صاحب نصاب پر لازم ہے، اس کی ادائگی میں کوتاہی کے سبب سے بڑے دردناک عذاب کا سزاوار ہو سکتا ہے، اس لیے کہ جتنی وعید کی آیتیں "عدم نفاق" پر

آئی ہیں ان سے مراد زکوٰۃ کی عدم ادائگی پر عذاب کا استحقاق ہے، لیکن صدقۂ نافلہ یا غیر واجبہ ایک قسم کا تبرع واحسان ہے، ان کے ادانہ کرنے پر خدا کی رحمت و ربوبیت سے بعید ہے کہ اپنے بندے کو مستحق سزا قرار دے، البتہ ضرور اس جذبے کو ابھارا گیا ہے کہ ایک مسلمان کے شایان شان یہ ہے کہ اپنے جیسے مسلمان کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرے۔

بہر حال صدقات کی دو قسمیں ہیں :(۱) صدقات واجبہ (۲) صدقات غیر واجبہ۔ صدقات واجبہ کی عدم ادائگی پر بندے کو سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے، اور صدقات غیر واجبہ یا بلفظ دیگر صدقات نافلہ کے عدم انفاق پر بندہ سزا کا مستحق نہیں ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی احادیث میں صدقات وخیرات کی جو عظمت و فضیلت بیان کی گئی ہے ان کا بھی تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ ہوجائے، تاکہ ان آیات الٰہیہ کی تفسیر خود معلم قرآن کے کلام بلاغت نظام سے ہوجائے۔

فضائل صدقات

(۱)۔عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ " أَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلَى عُرْيٍ كَسَاهُ اللَّهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلَى جُوعٍ أَطْعَمَهُ اللَّهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقَى مُسْلِمًا عَلَى ظَمَإٍ سَقَاهُ اللَّهُ مِنَ الرَّحِيقِ الْمَخْتُومِ "(سنن ابی داؤد کتاب الزکاۃ باب فی فضل سقی الماء ص : 315، دارالفکر بیروت، رقم 1682)

ترجمہ: ابوسعید رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق سرکار نے ارشاد فرمایا جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو اس کی بے ستری میں لباس پہنایا تو اللہ اس کو جنتی لباس سے نوازے گا، جس مسلمان نے کسی مسلمان کو اس کی بھوک کی حالت میں کھانا کھلایا تو اللہ اس کو جنت کے پھلوں سے کھلائے گا اور جس مسلمان نے کسی مسلمان کو اس کی تشنگی میں پانی پلایا تو اللہ تعالٰی اس کو جنت کے خالص شراب طہور سے سیراب فرمائے گا۔

انسان کی بنیادی ضرورتوں میں کھانا، لباس اور پانی ہے، ان چیزوں کے بغیر اس کی زندگی اجیرن ہوسکتی ہے، بلکہ بعض اوقات اس کی زندگی فنا کے گھاٹ پہنچ سکتی ہے، اسی لیے فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات کھانا پینا واجب ہوجاتا ہے، اس بنا پر حضور اکرم

ﷺ نے اپنے متبعین کے جذبۂ ترحم کو ابھارا ہے کہ تمھاری اسلامی اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے کسی بھائی کو بے ستر نہ رہنے دو، اگر وہ بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھلا کر اللہ کے فضل و کرم کے سزاوار بن جاؤ، اگر وہ پیاسا ہے تو اس کی پیاس بجھا کر شراب طہور کے مستحق ہو جاؤ، گویا حضور اکرم ﷺ امت مسلمہ کو یہ تلقین فرمانا چاہتے ہیں کہ تم جو کچھ نیکی کرو گے اس کے اجر و ثواب سے محروم نہیں رہو گے بلکہ جنت میں تم کو اس سے کہیں بہتر چیزیں دے جائیں گی، آپ نے اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ دنیا ہی میں تم کو اس کا صلہ ملتا رہے گا، کیوں کہ دنیا کا کوئی اجر ،کوئی معاوضہ آخرت کے اجر و ثواب سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، یہاں جتنی بھی نعمت ملے وہ سب فانی اور غیر باقی ہیں، ابدی راحت و سرور تو جنت کی نعمتوں میں ہے۔

(۲)-عن ابن مسعود -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: «لا حَسَدَ إلا في اثنتين: رجل آتاه الله مالا، فسَلَّطَه على هَلَكَتِهِ في الحَقِّ، ورجل آتاه الله حِكْمَة، فهو يقضي بها ويُعَلِّمَها»(صحيح البخاری باب انفاق المال فی حقه ج 1 ص ،189 رقم 1409، قدیمی کتب خانه کراچی)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا "حسد "صرف دو آدمیوں سے کیا جا سکتا ہے: ایک ایسا شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا پھر اس کو راہ حق میں بے دریغ خرچ کرنے کا حوصلہ عطا فرمایا، دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم و دانش سے نوازا تو اس سے وہ فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔

حسد ایک امر قبیح ہے ،کیوں کہ یہ دوسرے کی نعمت کے زوال کی آرزو کا نام ہے ،اس کے اندر ایک عنصر یہ بھی شامل ہے کہ اس نعمت کی خواہش اپنے لیے کرے اور انسان کی ہر خواہش پوری ہو جائے، یہ مستعبد امر ہے،اس لیے جذبۂ حسد سے خواہ مخواہ کے لیے حاسد ایک عذاب الیم میں گرفتار رہتا ہے، جب یہ جذبہ حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو محسود کی ساری خوبیاں حاسد کی نگاہ میں برائیوں کی شکل میں نظر آتی ہیں، اس کی خوبی و کمال کے بیان سے اس بد نصیب کو قلبی اذیت پہونچتی ہے ،اگر اس کی خوش اخلاقی اور عالی ظرفی کا تذکرہ ہو تو یہ کم ظرف اپنے حسد کی آگ سے جل اٹھتا ہے ،اس لیے ظاہر ہے کہ ایسے امر قبیح کی ستائش زبان نبوت سے نہیں ہو سکتی، پھر اس حدیث پاک کا کیا مفہوم ہے؟ شارحین حدیث فرماتے ہیں

کہ اس حدیث پاک میں اگر چہ لفظ "حسد" کا استعمال کیا گیا ہے مگر وہ اپنے معروف معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس سے "رشک" مراد لیا گیا ہے، اب حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر چہ دنیا میں مختلف قسم کے صاحب کمال پائے جاتے ہیں، جن کی ظاہری حالت کو دیکھ کر رشک کیا جاسکتا ہے، کوئی ادب و لسانیات کا ماہر ہے، کوئی فن شاعری میں اپنے کمال کا مظاہرہ کرتا ہے، کوئی خطاطی میں اونچے مقام پر فائز ہے، کوئی کسی ہنر میں فائق تر نظر آتا ہے، مگر یہ سب اس لائق نہیں ہیں کہ ایک بلند نظر انسان اس کو خاطر میں لائے، یعنی ان سے رشک کرے، ہاں صرف دو قسم کے انسان ایسے ہیں جو اس قابل ہیں کہ ان پر رشک کیا جائے، ایک ایسا مال دار جو اپنی دولت کو بے دریغ راہ حق میں صرف کر رہا ہو، دوسرا وہ شخص جو علم و دانش سے نوازا گیا ہو اور اپنے مقتضائے علم پر عمل کر کے حق فیصلہ صادر کرتا ہو، اور نشر علوم میں اپنے قیمتی اوقات صرف کرتا ہو، گویا مال دار اور عالم اس لائق ہیں کہ ان سے رشک کیا جائے۔

(۳) وعن أبي هريرة قال: قالَ رسُولُ اللَّه ﷺ: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ في ظِلِّهِ يَوْمَ لا ظِلَّ إلَّا ظِلُّهُ: إمامٌ عادِلٌ، وشابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللَّه تَعالى، وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ في المَسَاجِدِ، وَرَجُلانِ تَحَابًّا في اللَّه: اجتَمَعا عَلَيهِ، وتَفَرَّقَا عَلَيهِ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ، وَجَمَالٍ فَقَالَ: إنِّي أَخافُ اللَّه، ورَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فأَخْفَاها، حتَّى لا تَعْلَمَ شِمالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينهُ، ورَجُلٌ ذَكَرَ اللَّه خالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ متفقٌ عَلَيْهِ.(صحيح البخارى باب الصدقة باليمين ج١ ص ١٩١، قديمى كتب خانه كراچى)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق سرکار نے فرمایا کہ سات قسم کے انسان ایسے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو اپنے سایۂ رحمت میں رکھے گا جس دن اللہ کے سایۂ رحمت کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، (۱) انصاف پسند حاکم (۲) ایسا جوان جس کی نشو و نما اللہ کی عبادت میں ہوتی رہی (۳) ایک ایسا شخص جس کا دل مسجد میں لگا رہے (۴) دو ایسے آدمی جنہوں نے باہم ایک دوسرے سے اللہ کے لیے محبت کی ہو اور اللہ ہی کی محبت میں جمع ہوتے ہوں اور جدا ہوتے ہوں (۵) ایک ایسا شخص جس کو کسی عورت نے بری نیت سے جو حسن و جمال اور حسب و نسب والی تھی اپنے پاس بلایا تو اس نے کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا

ہوں(۶)ایسا آدمی جو صدقہ چھپا کر دے یہاں تک کہ اس کا بایاں ہاتھ نہ جان سکے کہ دایاں ہاتھ کیا خرچ کر رہا ہے(۷)ایک ایسا شخص جو خلوت میں اللہ کی یاد کرے تو خشیت الٰہی سے اس کی آنکھیں اشک بار ہوجائیں۔

اس حدیث پاک میں سات قسم کے انسانوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ وہ قیامت کے دن رب ذوالجلال کے قہر وجلال کے ظہور کے وقت اس کے سایۂ رحمت میں رہیں گے ان میں صدقہ دینے والے کو بھی شامل فرمایا گیا، اس لیے اگر کسی شخص کی یہ تمنا و خواہش ہو کہ خدائے پاک کے جلال کے وقت قیامت کی دھوپ سے اپنے محفوظ رکھے تو اس کو حسن نیت کے ساتھ صدقہ کرنا چاہئے۔

(۴)عَنِ الْحَسَنِ ، قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : " حَصِّنُوا أَمْوَالَكُمْ بِالزَّكَاةِ ، وَدَاوُوا مَرْضَاكُمْ بِالصَّدَقَةِ ،رواہ ابو داؤد۔(فتاوی رضویه ج۴ص ۴۳۴ مکتبه رضویه کراچی)

ترجمہ: حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار نے فرمایا کہ اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرکے ان کی حفاظت کرو اور صدقہ دے کر اپنے مریضوں کا علاج کرو۔

اس حدیث پاک سے دو اہم باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتا رہے تو اس کا مال اس قدر محفوظ ہوجائے گا کہ وہ گویا ایک مستحکم قلعہ کے اندر رکھا ہوا ہے جو کسی طرح سے ضائع نہیں ہوسکتا، نہ چور اس کو چرا سکتا ہے نہ کسی دوسرے سبب سے اس کو کوئی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، یعنی وہ اللہ کی حفاظت و صیانت میں رہے گا کہ وہ اس کے ضائع ہونے کی تمام راہوں کو مسدود فرمادے گا، دوسرے یہ کہ اگر کوئی شخص مریض ہو اور دوا علاج سے شفایابی کے امکانات مدھم پڑ گئے ہوں تو اس کی طرف سے اس کے تیمارداروں کو صدقہ کرنا چاہیے، اس سے شافیٔ مطلق کی طرف سے شفایابی کی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

(۵)عن أبي موسى الأشعري ،عن النبي ﷺ قال: على كل مسلم صدقة،فقالوا:يانبی الله! فمن لم يجد ؟قال: يعمل بيده فينفع نفسه ويتصدق ،قال: أرأيت إن لم يستطع؟ قال: يعين ذا الحاجة الملهوف قال: أرأيت إن لم يستطع، قال: يأمر بالمعروف أو الخير. قال: أرأيت إن لم يفعل؟ قال: يمسك عن الشر، فإنها صدقة۔ (بخاری شریف،ج ۱، کتاب الزکوة،

رقم الحدیث ۱۴۴۵)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق سرکار نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے، صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول جو صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ پائے پھر وہ کیسے صدقہ کرے؟ تو سرکار نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے کام کر کے یعنی کما کر خود اپنی ذات کو فائدہ پہنچائے اور صدقہ کرے، اس پر عرض کیا گیا کہ اگر یہ بھی نہ ہو یعنی کام کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو پھر کیا کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی محتاج، داد کے طلب گار کی مدد کرے، لوگوں نے کہا کہ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو؟ تو آپ نے فرمایا کہ اچھا کام کرے اور برائیوں سے اپنی ذات کو دور رکھے یہی اس کی جانب سے صدقہ ہے۔

صدقہ کا مفہوم عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی مفلس و نادار کو اپنے مال کا کچھ حصہ دے دے، لیکن حضور ﷺ نے اس کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا کر دی، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی مظلوم کی داد رسی کر دے اور ظالم کی ظالمانہ حرکتوں سے مظلوم کو محفوظ کر دے تو اس کو بھی صدقہ میں داخل فرمایا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آپ نے نیک کام کرنے اور اپنی ذات کو برائیوں سے محفوظ رکھنے کو بھی صدقے کے مفہوم میں شامل فرمایا، کیا اب کسی کے لیے یہ گنجائش رہ گئی کہ وہ صدقہ سے راہ فرار اختیار کرے؟ کیا کسی انسان کے اندر اتنی بھی استطاعت نہیں ہے کہ عمل خیر وہ بجالائے؟ یعنی اپنی زبان سے کسی کو نیکی کا حکم دے؟ اور کسی کو برائی سے روکے؟ اور خود اپنی ذات کو برائیوں سے محفوظ رکھے؟ لاریب ہر شخص کے اندر اتنی بات کی استطاعت ہے کہ وہ برائی نہ کرے، پھر وہ صدقہ کے ثواب کا ضرور حق دار ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ صدقے کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں رہ گیا کہ میں کیسے صدقہ کروں؟ جب کہ میں مفلس و نادار ہوں۔

(٦)۔عن ابی ذر قال :انتهیت الیٰ النبی ﷺ و هو جالس فی ظل الكعبة، فلما رآنی قال :هم الاخسرون و رب الكعبة، فقلتُ: فِدَاکَ اَبی و اُمی مَن هُم ،قالَ :هُمُ الاكثرونَ، الا مَن قال: هكذا وهكذا من بینِ اَیدِیهِ وَ مِن خَلفِهٖ وَ عَن یَمینهٖ و عن شمالهٖ و قلیل ماهم۔[مشکوٰۃ شریف ج١ ص ١٦٣ مجلس برکات مبارک پور]

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری نے کہا کہ میں سرکار دوعالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ کعبہ شریف کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے، پھر جب مجھ کو دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ کعبہ کے رب کی قسم وہ لوگ بہت نقصان اٹھانے والے ہیں میں نے عرض کی آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں وہ کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے مگر جو ایسا ایسا کرے یعنی اپنے سامنے پیچھے، دائیں، بائیں، اپنے مال کو لٹائے، ہاں ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جس بندے کو دولت و ثروت سے خوب خوب نوازا ہے اگر اس نے کار خیر میں اپنا مال صرف نہ کیا تو بالآخر وہ ناکام و نامراد ہو گا اور آخرت میں اس کو بڑی محرومی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

الصادق الامین حضور اکرم ﷺ کے ان ارشادات عالیہ سے صدقہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور اس کی فضیلت و برتری کو محسوس کر کے اپنے مجبور و لاچار بھائی کی دست گیری سے انسانیت اور مروت کا بلند مرتبہ حاصل کیا جاسکتا ہے اور جب اس طرح سماج و معاشرے میں انسانیت دوستی کا ولولہ پیدا ہو جائے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کے افراد و ارکان بے یار و مددگار ہو کر قساوت قلبی و بے رحمی کا شکار ہو جائیں یعنی ان کی ضرورتیں حاجتیں پوری نہ ہوں اور ان کو دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے کہ وہ دوسرا اس کو قرض دے اور اس سے زائد رقم "سود" وصول کرے، یعنی اگر مکمل طور سے صدقات و خیرات کا جذبۂ ترحم ابھر کر سامنے آجائے تو خود بخود سود کی لعنت سے رہائی حاصل ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ نبی امی فداہ ابی و امی ﷺ نے اگر ایک طرف سود کی مذمت و حرمت نہایت بلیغ و مؤثر الفاظ میں بیان فرمائی تو دوسری طرف اپنے متبعین کو مختلف اسلوب بیان سے صدقات و خیرات کی رغبت دلائی نیز زکوٰۃ کا نظام قائم کرنے کا حکم (سرمایہ پرستوں کے ہوس زر سے مسلمانوں کو محفوظ و مامون کرنے کے لیے) دیا۔

نظام زکوٰۃ کے قیام کا حکم

عن ابن عباس -رضي الله عنهما-: أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- لما بعث معاذا إلى اليمن فقال: "إنك تأتي قوما أهل الكتاب،

فليكن أولَ ما تدعوهم إليه شهادة أن لا إله إلا الله" -وفي رواية: "إلى أن يوحدوا الله-، فإن هم أطاعوك لذلك فأعلمهم أن الله افترض عليهم خمس صلوات في كل يوم وليلة، فإن هم أطاعوك لذلك فأعلمهم أن الله افترض عليهم صدقة تؤخذ من أغنيائهم فَتُرَدُّ على فقرائهم، فإن هم أطاعوك لذلك فإياك وكَرَائِمَ أموالِهم، واتق دعوة المظلوم فإنه ليس بينها وبين الله حجاب".(صحيح البخارى باب وجوب الزكاة ج١ص ١٨٧، رقم ١٤٩٦، قديمى كتب خانه كراچى) (صحيح مسلم ج ١ ، باب الدعاءالى الشهادتين و شرائع الاسلام،رقم ١٩)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو آپ نے فرمایا تم ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہے، پہلے ان کو اس بات کی گواہی کی طرف بلاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں ﷺ پھر اگر وہ اس بات کو مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کی بھی اطاعت کر لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے وصول کی جائے گی اور ان کے محتاجوں پر لوٹا دی جائے گی اور، اگر اس بات کی بھی فرماں برداری کر لیں تو تم ان کے عمدہ مال کے وصول کرنے سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کیوں کہ اس کے درمیان اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

اس فرمان رسول سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

(الف) اسلامی احکام و عقائد کی تبلیغ و نشر میں تدریج کی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے، شریعت اسلامی کے فرائض و ذمہ داریوں کو ایک ساتھ نہیں پیش کرنا چاہیے، یکایک تمام احکام اسلام کو نومسلموں یا جاہلوں پر پیش کر کے ان کو الجھن میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے۔

(ب) زکوٰۃ کی وصولی مسلمانوں کا انفرادی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی کام ہے جس کی ذمہ داری اسلامی ریاست کے اوپر ہے اور حاکم وقت پر لازم ہے کہ زکوۃ کی وصولی کے لیے ایک نظام مرتب کرے پھر مستحقین زکوٰۃ پر اس کو تقسیم کرے، ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ غریب مسکین یا جو مستحق زکوٰۃ ہیں خود اس کی وصولی کریں بلکہ اسلامی ریاست کا سربراہ کارکنوں کو مقرر کر کے

وصولی کروائے اور وہ غریبوں اور ناداروں پر تقسیم کرے کیوں کہ وہی محتاجوں کی ضرورتوں کے پوری کرنے کا ذمہ دار ہے۔

(ج) زکوٰۃ کی وصولی میں توسط و اعتدال کی راہ اختیار کرنی چاہئے ،جبر و اکراہ سے اچھی اچھی چیزوں کو زکوٰۃ یا عشر میں لینا جائز نہیں ہے ،بلکہ اوسط درجے کی چیزوں کو زکوٰۃ میں لینا چاہیے، مثلاً کوئی کارکن یا عامل کاشت کاروں سے عشر وصول کر رہا ہو تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ عمدہ قسم کا گیہوں لے لے اور خراب قسم کا گیہوں کاشت کاروں کے لیے چھوڑ دے۔

۲۔وَعَنْ أَبي هُريرةَ قالَ: لمَّا تُوُفي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، وَكانَ أَبُو بَكْر، وَكَفَرَ مَنْ كَفَرَ مِنَ العربِ، فَقَالَ عُمرُ: كيفَ تُقَاتِلُ النَّاسَ وَقدْ قَالَ رسُولُ اللَّهِ ﷺ: أُمِرتُ أَنْ أُقاتِلَ النَّاسَ حتَّى يَقُولُوا لاَ إِلهَ إِلاَّ اللَّه فَمَنْ قَالَهَا، فقَدْ عَصَمَ مِني مَالَهُ وَنَفْسَهُ إِلاَّ بِحَقِّه، وَحِسَابُهُ عَلى اللَّهِ؟ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: واللَّهِ لأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلاةِ والزَّكاةِ، فإِن الزَّكَاةَ حَقُّ المَالِ. واللَّهِ لَو مَنعُوني عِقَالًا كانَوا يُؤَدونَهُ إِلى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلَى منعِهِ، قَالَ عُمرُ: فَوَاللَّهِ مَا هُو إِلاَّ أَن رَأَيْتُ اللَّه قَدْ شَرَحَ صَدْرَ أَبي بَكْرٍ للقِتَالِ، فَعَرفْتُ أَنَّهُ الحَقُّ. مُتفقٌ عَلَيْهِ.(بخارى شريف ج۱، كتاب الزكوة، رقم۱۳۹۹) (صحيح مسلم، كتاب الايمان، ج ۱، رقم ۲۸)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ نے بتایا کہ جب سرکار دوعالم ﷺ وفات پا گئے اور ابو بکر ان کے خلیفہ ہوئے اور عرب میں سے کچھ لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی یعنی اسلام سے مرتد ہو گئے ،تو حضرت ابو بکر ایسے مرتدین سے قتال کے لیے آمادہ ہو گئے ،اس پر حضرت عمر نے کہا کہ آپ کیسے قتال کریں گے ،حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ لوگوں سے مجھ کو قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ لا الہ الا اللہ کہیں، پھر جس شخص نے اسے کہہ لیا اس کا مال اس کی ذات مجھ سے محفوظ ہو گئی، الا یہ کہ شرعی حق اس کے اوپر واجب ہو جائے اور اس کا حساب اللہ کے یہاں ہو گا، تو حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا کہ بخدا ضرور ایسے لوگوں سے قتال کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کیا ہے، کیوں کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، بخدا اگر انہوں نے بکری کے ایسے بچے کو روک لیا جسے وہ زکوٰۃ میں سرکار کو دیتے تھے تو اس کے روک لینے پر بھی میں

ان سے جہاد کروں گا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس بات کے لیے بخدا ابوبکر کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے کھول دیا اور مجھے بھی عرفان حاصل ہو گیا کہ یہ بات حق ہے۔

اس حدیث پاک سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ اگر کوئی شخص ازراہ انکار اسلامی ریاست کو زکوٰۃ ادا نہ کرے تو وہ اسلام کا منکر ہو گیا، ایسے لوگوں سے جہاد کرنا اسلامی ریاست کا فریضہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ ان کی ذات و مال اب محفوظ نہیں رہ گئے، اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ اسلامی حکومت پر لازم ہے کہ زکوٰۃ کا نظام قائم کرے کیوں کہ زکوٰۃ و عشر وغیرہ کی تحصیل کا کام اسلامی حکومت ہی کے ذمے ہے، اگرچہ انفرادی طور پر زکوٰۃ کے ادا کرنے سے اس کے فریضے سے سبک دوش ہونے میں کلام نہیں کیا جاسکتا تاہم وہ مقاصد عالیہ جو زکوٰۃ و عشر کی وصولی سے حاصل ہو سکتے ہیں انفرادی طور پر ادا کرنے سے حاصل نہ ہوں گے۔

ان تمام تشریحات و تفصیلات سے دو باتیں کھل کر سامنے آئیں:

ہر مسلمان صاحب استطاعت کو راہ خدا میں اپنا مال صرف کرنا چاہیے۔

صدقات و خیرات، زکوٰۃ و عشر واجبات مالیہ وغیر واجبات کی تحصیل کا نظام قائم کرنا چاہئے اور ان کو ان مصارف میں اسلامی ریاست خرچ کرے جن کی صراحت قرآن حکیم میں کی گئی ہے اور جن کے جزئیات کی تفصیلات فقہ اسلامی کی کتابوں میں موجود ہے۔

لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ انفرادی طور سے زکوٰۃ و صدقات وغیرہ کی ادائگی ہوتی ہے مگر کوئی اجتماعی نظام برپا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی نہ کوئی بیت المال قائم کیا جاتا ہے جس میں زکوٰۃ کی رقم دی جائے، اگرچہ اسلامی حکومت بھارت میں نہیں پائی جاتی ہے تاہم مسلمان منظم ہو کر اگر اس کا نظم قائم کریں تو اس کی راہ میں غیر مسلم حکومتیں رکاوٹ نہیں ڈالیں گی۔

دنیا میں خدا جانے کتنے فلاحی ادارے کام کر رہے ہیں، کہیں معذوروں کی مدد کے لیے انجمنیں قائم ہیں، کہیں یتیموں کی تعلیم و تربیت کے لیے کامل نظم کے ساتھ ادارے کام کر رہے ہیں، کہیں بیماروں اور مریضوں کے علاج و معالجہ کے لیے اسپتال قائم کر دیئے گئے ہیں، کہیں جنگ کے زخمیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کے لیے انتظام کیا گیا ہے، فساد زدہ یا آسمانی آفتوں میں جو لوگ گھر گئے ہوں ان کی راحت رسانی کے لیے کمیٹیاں قائم کر دی گئی ہیں، یہ سب کام وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ

لوگ اسلام کے مخالفوں اور اس کے معاندوں کے زمرے میں شامل ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم لوگ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں، لیکن اتنی بات متحقق ہے کہ ان کی نظر میں حیات بعد الممات زندگی نہیں ہوتی، نہ یہ سب خوف خدا اور خوف آخرت رکھتے ہیں، جس سے ان کی نیتوں میں اخلاص پیدا ہو جائے، بلکہ یہ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں محض نام و نمود اور دنیا میں اپنی یادگار قائم کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

ان تمام فلاحی کاموں کو مسلمانوں کو کرنا چاہئے تھا، کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق ہر مال دار مسلمان پر نہ صرف یہ لازم ہے کہ اپنے مال کا معتد بہ حصہ کار خیر میں صرف کرے بلکہ اس کے حق میں یہ بھی بہتر ہے کہ صدقات و خیرات سے اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے، اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان نظام زکوٰۃ و خیرات برپا کریں تاکہ غریبوں کی خاطر خواہ مدد ہو سکے اور لاچاروں اور مجبوروں کی زندگی کو ہلاکت سے بچانے کے لیے کوئی معقول انتظام ہو سکے، اگر مسلمان صرف اتنا کام کرتے کہ زکوٰۃ کا نظام اس کی ٹھوس بنیادوں پر استوار کرتے تو سودی کاروبار یا لین دین کی جڑ خود ہی کٹ جاتی، سود خواہ تجارتی کاموں کے لیے لیا جائے یا زرعی ضرورتوں کے لیے ان سب کی بنیاد یہی ہے کہ اس برق رفتار ترقی کے دور میں سود لیے دیئے بغیر مسلمانوں کی ضرورتیں کیسے پوری ہوں، کامل وثوق اور پورے انشراح صدر کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگر صحیح ڈھنگ سے زکوٰۃ و صدقات و عشر وغیرہ کا نظام برپا کر دیا جائے اور مسلم جماعت کا ہر فرد اپنی قومی ضرورت کا احساس رکھے تو مسلمانوں کو دنیا کے سودی اداروں پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، ان کی ساری ضرورتیں ان کے قومی ادارے یا بیت المال سے پوری ہو جائیں گی، ہاں اس نظام کے برپا کرنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے، مخلص کارکنوں کی فوج سے انقلاب عظیم کی راہیں ہموار کی جا سکتی ہیں، ہم کو ہر مقام پر فاسد نظام سے ٹکر لینی پڑے گی اور اپنی جاں بازی اور جاں سپاری سے ہم کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہم دنیا کی زندگی کو کوئی حیثیت نہیں دیتے، ہم کم نظر نہیں بلکہ بلند نگاہ رکھتے ہیں، ہماری نگاہ میں صرف آخرت کی زندگی قدر و قیمت رکھتی ہے۔

بہر حال اب مناسب تصور کرتا ہوں کہ کچھ فقہی احکام و جزئیات زکوٰۃ کے سلسلے میں پیش کر دیئے جائیں تاکہ ہمارے قارئین کرام کی نگاہ میں یہ بات رہے کہ جو کچھ زکوٰۃ کی ادائگی

ہو رہی ہے یا جس انداز سے ہو رہی ہے وہ صحیح ڈھنگ سے ہو۔

مسائل زکوٰۃ

اسلام میں زکوٰۃ اللہ کی رضا جوئی کی نیت سے کسی مسلمان فقیر کو اپنے مال میں سے مقررہ حصہ کے مالک بنا دینے کا نام ہے، لیکن زکوٰۃ کی رقم ہاشمی کو نہیں دی جا سکتی، نہ شوہر اپنی بیوی کو، نہ بیوی اپنے شوہر کو، نہ کوئی شخص اپنی اولاد یعنی بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی وغیرہ کو دے سکتا ہے، بلکہ ان کی مدد و اعانت اپنے ذاتی مال سے کرنا ہوگی۔ (ردالمختار ج۳ص ۱۷۰۔۱۷ادار عالم الکتب، السعودیہ)

زکوٰۃ کی ادائگی میں تملیک شرط ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو زکوٰۃ ادا کی جائے اس کو مالک بنا کر اس کو اس پر قبضہ دے دیا جائے۔ (الدرالمختار کتاب الزکوۃ ج۲ص۹)

اگر کوئی مال گم ہو جائے یا دریا میں غرق ہو جائے یا کسی کے پاس بطور امانت وہ مال رکھا ہوا تھا اور وہ انجان آدمی تھا، یاد نہیں آرہا ہے کہ وہ کون شخص تھا یا کسی شخص کے ذمے قرض تھا اور مقروض دینے سے انکار کر رہا ہے اور اس کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے اور ان تمام صورتوں میں مال مل جائے تو گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔[تنویرالابصار ج۲ص ۹، ردالمحتار ج ۳ص ۱۸۳، دار عالم الکتب، السعودیہ]

اگر کسی مسلمان آدمی پر قرض ہو اور وہ اس قرض کا اقرار کر رہا ہو مگر ادا میں تاخیر کر رہا ہے یا وہ نادار ہو گیا ہے یا قاضی کے یہاں اس کے دیوالیہ ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے یا وہ منکر ہے مگر قرض خواہ کے پاس گواہ موجود ہیں تو ان تمام صورتوں میں جب مال مل جائے تو سالہا سے گذشتہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔[حوالہ سابق، ص ۱۸۴]

اگر کوئی شخص صاحب نصاب ہو لیکن اس کے اوپر اتنا قرض ہے کہ قرض کی ادائگی کے بعد نصاب باقی نہیں رہے گا تو اس کے اوپر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔[ایضا]

زکوٰۃ اس مال میں واجب ہوتی ہے جو نصاب کو پہنچ جائے اور حاجت اصلیہ سے فارغ (زائد) ہو، حاجت اصلیہ اس حاجت کو کہتے ہیں جس کی طرف آدمی زندگی بسر کرنے میں محتاج ہو یعنی حاجت اصلیہ والی اشیا میں خواہ وہ کتنی قیمتی ہوں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جیسے رہنے کے مکانات، خواہ کتنے ہی قیمتی و عالیشان اور کروڑوں کی مالیت کے ہوں، جاڑے اور گرمی میں

پہننے کے کپڑے، خانہ داری کے سامان میز، کرسی وغیرہ، سواری کے جانور، آلات حرب و جنگ، فن کاروں اور پیشہ وروں کے اوزار، اہل علم کی ضرورت کی کتابیں، کھانے کے غلے یہ سب ضرورت اصلیہ میں شامل ہیں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ [ردالمحتار کتاب الزکوۃ ج ۳ ص ۱۸۶ دار عالم الکتب، السعودیہ]

اہل علم کے لیے لاکھوں روپئے کی کتابیں حاجت اصلیہ میں داخل ہیں اور غیر عالم کے پاس بھی کتابیں ہوں توان میں بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی جب تک کہ تجارت کے لیے نہ ہوں، فرق اتنا ہے کہ اہل علم کے پاس ان کتابوں کے علاوہ اگر کوئی مال بقدر نصاب نہ ہو تو اس کو زکوٰۃ جائز ہے اور غیر اہل علم کے لیے ناجائز ہے جب کہ اس کے پاس دو سو درہم کی قیمت کی کتابیں ہوں۔ [ردالمحتار ج ۳ ص ۱۸۷، مطبع سابق]

موتی اور جواہر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اگرچہ لاکھوں کی مالیت کے ہوں، ہاں اگر تجارت کی نیت سے ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوجائے گی، در مختار اور تنویر الابصار میں ہے:

لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواہر و ان ساوت الفاً اتفاقاً الا ان تکون للتجارۃ والاصل ان ماعدالحجرین والسوائم انما یزکیٰ بنیۃ التجارۃ (تنویرالابصار ج۲ ص ۱۴)

موتی اور جواہر میں زکوٰۃ نہیں، اگرچہ وہ ہزاروں کی مالیت کے ہوں، اس پر ائمہ کا اتفاق ہے، مگر یہ کہ تجارت کے لیے ہوں، قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ سونا چاندی اور سوائم کے علاوہ میں صرف تجارت کی نیت سے زکوٰۃ دی جائے گی۔

مال تجارت یا سونا چاندی کو درمیان سال میں اپنی جنس یا غیر جنس سے بدل لیا تو اس وجہ سے سال گذرنے میں کمی نہ ہوگی، یعنی حولان حول کا شمار تبدیلی کے پہلے والے وقت سے ہوگا، مثلاً کسی شخص کے پاس سو تولہ چاندی تھی، درمیان سال میں چھ مہینہ گذرنے کے بعد اس چاندی کو سونے سے بدل لیا، اب اگر یہ کہے کہ اس سونے پر جب سال گذرے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی تو اس کی بات تسلیم نہیں کی جائے گی اور سال گذرنے کا حساب چھ ماہ پہلے سے ہوگا، یعنی اس مال پر جیسے ہی مزید چھ ماہ اور گزریں گے زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔ [فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۹۰]

اگر کوئی شخص سال بھر تک خیرات کرتا رہا، اب اس نے یہ نیت کرلی کہ جوکچھ دیا ہے وہ زکوٰۃ ہے توزکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔[فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ۸۷]

زکوٰۃ کے ادا کرتے وقت یا اپنے مال سے علیٰحدہ کرتے وقت نیت شرط ہے، نیت کے معنٰی یہ ہیں کہ اگراس سے دریافت کیا جائے کہ یہ کیسا مال ہے تو وہ بلا تامل بتا سکے کہ یہ زکوۃ کا مال ہے۔(ایضًا)

مال کو بہ نیت زکوۃ علیٰحدہ کردینے سے کوئی شخص بری الذمہ نہ ہوگا جب تک کہ اس کی ادائگی نہ ہوجائے، فرض کیجیے کہ کسی شخص نے اپنے مال سے زکوٰۃ کے مال کو علیٰحدہ کردیا اور وہ مال زکوٰۃ کسی طرح ضائع ہوگیا، توزکوٰۃ ساقط نہ ہوگی، بلکہ دوبارہ اس کے اوپر زکوٰۃ کا ادا کرنا واجب ہوگا اوراگر مرگیا تواس میں وراثت بھی جاری ہوگی، یعنی کسی شخص نے اگر اپنے مال سے زکوٰۃ کے مال کو علیٰحدہ کردیا اور زکوٰۃ ادا نہ کی اور انتقال ہوگیا تواس میں بھی وراثت جاری رہے گی۔[الدر المختار ج ۳ ص ۱۹۱، دار عالم الکتب، السعودیہ]

زکوٰۃ کا روپیہ مردے کی تجہیز وتکفین یا مسجد کی تعمیر میں صرف نہیں کیا جا سکتا البتہ اگر ایسی ضرورت پیش آجائے توزکوٰۃ کے روپۓ کا مالک کسی فقیر کو بنادے وہ اپنی طرف سے ان نیک کاموں میں صرف کرے تودونوں کو ثواب ملے گا۔[الدر المختار ج ۲ ص ۶۲]

زکوٰۃ دینے میں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ فقیر کوزکوٰۃ کہ کردے، بلکہ صرف نیت کافی ہے، حتیٰ کہ اگر ہبہ یا قرض کہہ کر دے اور نیت زکوٰۃ کی ہو تو ادا ہوجائے گی۔[فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ۱۸۹، دار الکتب العلمیہ بیروت]

اسی طرح نذر یا ہدیہ یا پان کھانے کے لیے یا بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے یا عیدیانہ کے نام سے زکوٰۃ دی توزکوٰۃ ادا ہوجائے گی، بعض حاجت مند زکوٰۃ کا روپیہ لینا نہیں چاہتے، اگر انہیں زکوٰۃ کہہ کر دیا جائے گا تو وہ لینے سے انکار کردیں گے اس لیے ان کو دیتے وقت زکوٰۃ کا لفظ بولنا نہیں چاہیے۔[بہار شریعت پنجم ص ۸۹۶، مکتبہ المدینہ]

اگر (مثلاً) کوئی شخص ایک ہزار روپۓ کا مالک ہے اور اس نے دو ہزار کی زکوٰۃ دے دی اور نیت یہ ہے کہ ایک ہزار اور حاصل ہوگیا تو یہ اس کی زکوٰۃ ہے ورنہ آئندہ سال کے حساب میں جوڑ لیا جائے گا تو یہ جائز ہے۔[فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ۱۹۴، دار الکتب العلمیہ بیروت]

اگر کسی شخص نے اپنا سرمایہ تجارت میں لگایا تو سال تمام ہونے پر اس اصل سرمایہ کی جو

چیزیں خریدی ہیں ان کی قیمت لگا کر اور جو منافع حاصل ہوئے ان سب پر زکوٰۃ واجب ہے۔[فتاویٰ رضویہ ج۴ص۲۷۴ مکتبہ رضویہ کراچی]

کھیت کی پیداوار پر زکوٰۃ نہیں ہے، عشر ہے، اس کے سوا اگرچہ سال کے مکمل ہونے پر کتنا ہی غلہ بچ رہے زکوٰۃ واجب نہیں ہے، زکوٰۃ صرف تین مالوں پر واجب ہوتی ہے: سونا چاندی اور وہ مال جو تجارت کی نیت سے خریدا گیا ہو یا چرائی والے جانور پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔[فتاویٰ رضویہ ج۴ص۴۵۰]

خالص سنی ادارے میں زکوٰۃ کا مال اس شرط پر دیا جاسکتا ہے کہ مدرسے کا مہتمم اس مال کو جدا رکھے اور خاص تملیک فقیر کے مصارف میں صرف کرے، مدرسین یا دیگر ملازمین کی تنخواہ اس سے نہیں دی جاسکتی، نہ مدرسے کی تعمیر یا مرمت وغیرہ میں صرف ہوسکتی ہے، نہ یہی ہوسکتا ہے کہ جن طلبہ کو مدرسے سے کھانا دیا جاتا ہے اس روپئے سے کھانا پکا کر ان کو کھلایا جائے ،البتہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ جن طلبہ کو کھانا دیا جاتا ہے ان کو نقد بہ نیت زکوٰۃ دے کر مالک بنادیں ،پھر وہ اپنے کھانے کے لیے واپس دے دیں یا جن طلبہ کا وظیفہ مقرر ہو محض بطور امداد ان کے وظیفے میں دے دیں یا کتابیں خرید کر طلبہ کو ان کا مالک بنادیں تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زکوٰۃ کے جتنے روپئے مدرسے کے مہتمم کو وصول ہوں بہ نیت زکوٰۃ کسی حاجت مند کو مالک بنادیں، وہ اپنی طرف سے مدرسے کو دے دے تو تنخواہ مدرسین و ملازمین وغیرہ جملہ مصارف مدرسہ میں صرف کیا جاسکتا ہے۔[فتاویٰ رضویہ جلد۴ص۴۶۸۔۴۶۹مطبع سابق]

اگر کسی شخص پر زکوٰۃ واجب ہوئی اور اس نے متعدّد سالوں تک زکوٰۃ ادا نہ کی، اب زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کی ادائگی کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سال اول کی زکوٰۃ ادا کرے، اب اس کے بعد دو صورتیں متصور ہوسکتی ہیں:(۱)اس مال میں دوسرے سال میں اضافہ ہوا ہے(۲)اس مال میں دوسرے سال میں اضافہ نہیں ہوا ہے، پہلی صورت میں اضافہ والی رقم کو باقی ماندہ اصل مال سے ملا کر زکوٰۃ ادا کرے، دوسری صورت میں صرف باقی ماندہ مال کی زکوٰۃ ادا کرے ،اسی طرح ہر سال کی زکوٰۃ ادا کردے، مثلاً کسی کے پاس سو تولہ چاندی تھی تو پہلے سال کی زکوٰۃ ڈھائی پرسنٹ نکالے، اب اس کے پاس ساڑھے ستانوے تولہ چاندی رہ گئی، اب دیکھے کہ اس پر اضافہ ہوا ہے کہ نہیں، اگر زیادتی ہوئی تو اس زیادتی اور ساڑھے ستانوے تولہ چاندی کی زکوٰۃ دوسرے سال کی ادا کرے اور اگر اضافہ نہیں ہوا ہے تو صرف ستانوے تولہ چاندی کی زکوٰۃ

نکالے، اسی طرح زکوٰۃ ادا کرے، خواہ دس سال گذر گئے ہوں یا بیس سال اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوگی۔[ماخوذ از فتاویٰ رضویہ ج۴ص ۴۲۴ مطبع سابق]

اگر کوئی شخص زکوٰۃ کا مستحق ہے اور اس کو زکوٰۃ کا مال دیا گیا یعنی مالک بنا دیا گیا، اس کو مکمل طور سے اختیار ہے کہ جہاں چاہے صرف کرے، بشرطے کہ برے کاموں میں صرف نہ کرے، یہاں تک کہ اگر وہ چاہے کہ کسی مسجد میں دے دے تو اس کو خرچ کرنے کا حق ہے، حالاں کہ براہ راست زکوٰۃ کا مال مسجد میں صرف کرنا جائز نہیں۔[ماخوذ از فتاویٰ رضویہ ج۴ص ۴۷۵ مطبع سابق]

۞

یادداشت

عصر حاضر میں سود کی نحوست کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت اور معاملات کے تقریباً اکثر شعبوں میں سود کی کار فرمائی نظر آتی ہے، بہت سارے جدید مسائل پیدا ہورہے ہیں جن میں سود و قمار کے کہیں نمایاں تو کہیں مخفی اثرات پائے جاتے ہیں، مگر عوام انہیں جائز سمجھ کر ان میں ملوث ہے، روزیاں حرام ہورہی ہیں، لوگوں کو اس کا احساس تک نہیں۔

ہمارے اسلاف نے بہت پہلے ایسے اصول وضوابط اور مسائل و جزئیات بیان کر دیے ہیں جن سے قیامت تک پیدا شدہ مسائل کا حل نکالا جاسکتا ہے، خصوصاً چودھویں صدی کے مجدد اعظم امام احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ نے اپنے فتاویٰ میں بہت سارے جدید مسائل حل بھی کیے ہیں اور ان کے حل کے اصول و قواعد بھی بیان کیے ہیں، سود و قمار پر مشتمل بہت سارے ایسے مسائل و معاملات ہیں جو آپ کے زمانے کی پیداوار تھے، ان میں سے بعض ایسے مسائل بھی ہیں جو ابھی تک رائج ہیں، ان مسائل سے بہت سارے اصول وضوابط مستنبط ہوتے ہیں جن سے عصر حاضر کے مسائل کے احکام بھی معلوم ہوتے ہیں۔

کتاب مستطاب "مسائل سود" جدید اور کچھ قدیم سودی مسائل پر" شیخ القرآن حضرت علامہ عبد اللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ کی تحقیقات کا حسین گلدستہ ہے، جس میں محقق علام نے موضوع سے متعلق اچھوتے انداز میں حق تحقیق ادا کیا ہے۔ جدید ترتیب، تخریج، تصحیح اور تقدیم کے ساتھ کتاب حاضر خدمت ہے۔

کمال احمد علیمی نظامی

دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی، یوپی

مبلغ اسلام ریسرچ سینٹر ممبئی انڈیا

Muballigh-E-Islam Reserch Center
Mumbai- India